عَلَیکُم اَنفُسَکُم لَا یَضُرُّکُم مَن ضَلَّ اِذَا اهتَدَیتُم

طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۴۰ء

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

دور جدید

مرتب	بدل اشتراک	پانچ روپیہ سالانہ
اخوندان حسین امام	ششماہی	تین ۳/- روپے

جلد (۳) شمارہ (۸) جمادی الاخری ۱۳۵۹ھ مطابق اگست ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

(۱) لمعات	ادارہ	۱ — ۷
(۲) نظم	اسد صاحب ملتانی	۸
(۳) ختم نبوت	چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۹ — ۳۲
(۴) حکومت الٰہیہ	شہزادہ سعید حلیم پاشا شہید	۳۳ — ۵۲
(۵) تار یا مضراب	ادارہ	۵۳ — ۶۵
(۶) حقائق و عبر	ادارہ	۶۶ — ۷۲
(۷) اطاعت امیر	جناب "مبصر"	۷۳ — ۹۰
(۸) نقد و نظر	ادارہ	۲۱ — ۹۲

لمعات

طلوعِ اسلام میں جب روایات پرستی کے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں تو ہمیں قطعاً اس کی توقع نہ تھی کہ فضا قبولیتِ حق و صداقت کے لئے اس قدر سازگار ہو چکی ہے۔ صدیوں کی کورانہ تقلید سے قوم کی جو حالت ہو چکی ہے اس کے پیشِ نظر ہمارا اندازہ تھا کہ بہت کم آوازیں ہماری تائید میں اٹھیں گی اور مخالفتوں کا سیلاب ہجوم کرکے امنڈ آئے گا لیکن مضامین کی اشاعت کے بعد نتائج ہماری توقع سے بالکل برعکس نمودار ہوئے۔ حلقۂ طلوعِ اسلام کی معتدبہ اکثریت نے ہمارے مسلک کی تائید و حمایت کی۔ ملک کی مقتدر اہلِ علم ہستیوں کی طرف سے ہمّت افزائی کے خطوط موصول ہوئے۔ شخصیت پرستی اور علمِ حدیث کے الگ پمفلٹ چھپوا لئے گئے تھے۔ ان کی چاروں طرف سے مانگ آئی۔ اور اب تھوڑے سے نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔ اس عمومی تائید و حمایت کے ساتھ کہیں کہیں سے مخالفت کی آوازیں بھی اٹھیں۔ شکایات و اعتراضات کے خطوط بھی موصول ہوئے۔ یقین فرمائیے کہ ہمیں تائید و حمایت کی آوازوں سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اعتراضات و مخالفتوں کی آوازے ہوتی ہے اس لئے کہ اعتراضات و مخالفت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان کو اپنے دلائل کی پختگی اور کمزوری صحیح طور پر بے نقاب نظر آجاتی ہے۔ ان معترضین میں ایک طبقہ تو ان جامد مقلدین کا ہے۔ جن کے نزدیک اپنے مسلک کی صداقت و حقانیت کی اس سے زیادہ کوئی دلیل نہیں کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے ہوئے دیکھا اور ہم بھی ان کے نقوشِ قدم پر چلنے لگے۔ یہ طبقہ تو نہ پہلے ہی ہمارے مخاطبین میں تھا اور نہ ہی اس کے بعد ہی انہیں درخورِ تخاطب سمجھا گیا کہ یہ وہ ہیں جن کے متعلق خود قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ

اُن کے (سینوں میں) دِل تو ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ (بظاہر انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت) حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔" دوسرا طبقہ ایسا تھا جنہوں نے ان مضامین پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس کے بعد ان کے دل میں جو شبہات باقی رہ گئے ان کے ازالہ کے لئے خطوط لکھے ان خطوط کا تفصیلی جواب لکھا گیا اور عرض کیا گیا کہ جب تک آپ کو پورا پورا اطمینان قلب حاصل نہ ہو جائے۔ آپ اسی طرح تکلیف فرما کر ہمیں لکھتے رہیئے۔ ہم انشاء اللہ کوشش کریں گے کہ آپ کی تسکین خاطر کا سامان بہم پہونچائیں۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنہیں طلوع اسلام سے قلبی لگاؤ ہے۔ انہوں نے ازراہِ اخلاص و ہمدردی تحریر فرمایا کہ (۱) طلوع اسلام میں اس قسم کے "نظری مسائل" چھیڑنے سے کیا حاصل۔ اور کہ (۲) اس نہج کے اختلافی مسائل سے طلوعِ اسلام کی ہر دلعزیزی پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ شق اول کے متعلق گذارش ہے کہ یہ مسائل محض نظری اور فروعی نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ دین اور صرف دین خالص کی راہ سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب تک ان کے سامنے وہ دین نہیں آئے گا جو نبیؐ اکرم کی وساطت سے انہیں دیا گیا تھا اور جس پر عمل پیرا ہو کر محمد رسول اللہ والذین معہ (حضور سرورِ کائنات اور قدوسیوں کی جماعتؓ) نے اس زمین پر خدا کی حکومت قائم کی تھی اس وقت تک ان کی کوئی کوشش منتج اثمار نہیں ہو سکتی۔ کہ ایمان کے ایمانِ صادقہ اور ایمان کے اعمال صالحہ ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ دینِ خالص کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ طلوعِ اسلام کا مقصد محض ہنگامی کوائف و احوال پر بحث و تمحیص نہیں بلکہ اس کا نصب العین قوم کے اعمالِ حیات کے ہر شعبہ کو دینِ قیّم کی محکم بنیادوں پر استوار کرنا ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ دین قیم کیا ہے اور وہ کونسے خارجی اثرات ہیں جنہوں نے رفتہ رفتہ دین کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ان مسائل پر گفت و شنید نظری اور فرعی نہیں بلکہ عملی اور اصولی ہے۔ باقی رہی دوسری شق۔ تو ہم اپنے ان مخلص بہی خواہان کے جذبات ہمدردی کی پوری پوری قدر کرنے کے باوجود ان کی خدمت میں بلا تامل عرض کئے دیتے ہیں کہ کتمانِ حقیقت سے حاصل شدہ ہر دلعزیزی قرآن کریم کے لغت میں منافقت و مداہنت

کہلاتی ہے۔ اور ہم دعا کرتے ہیں اور آپ بھی ہماری اس دعا میں شریک ہو جائیے کہ اللہ تعالےٰ طلوعِ اسلام کو اس قسم کی "ہر دلعزیزی" سے ہمیشہ بچائے رکھے۔ قرآنی معیارِ عزت و شہرت تو کچھ اور ہی ہے۔ بقول مولانا محمد علی مرحوم

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

طلوعِ اسلام کے لئے ہزار سرفرازی و سربلندی اس میں ہے کہ خواہ ساری دنیا اس کی مخالف ہو جائے لیکن اُس کی بارگاہِ صمدیت میں اس کا شمار حق کی حمایت کرنے والوں میں رہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے جس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

اس باب میں جس قدر اعتراضات ہمارے سامنے آئے ہیں ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا کہ معترضین حضرات نے پہلے ہی اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا کہ "یہ منکرینِ حدیث" کا فتنہ ہے۔ یہ "اہلِ قرآن" کی ضلالت ہے۔ اور اس کے بعد اسی رنگین چشمہ سے ان مضامین کا مطالعہ کیا اور وہ اعتراضات لکھکر بھیجدئے جو پہلے سے ہی وضع کر لئے گئے تھے۔ حالانکہ ان کے جواب خود ان مضامین میں موجود تھے۔ چنانچہ جب انہیں لکھا گیا کہ ان اعتراضات کے جواب تو فلاں فلاں صفحات پر پہلے ہی موجود ہیں۔ تو اس کے بعد یہ حضرات خاموش ہو گئے۔ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے چند الفاظ میں پھر دیکھ لیجئے کہ ان مضامین میں کیا لکھا گیا ہے۔ دعوےٰ یہ ہے۔ کہ

(۱) دین یقینی شے ہے۔ قیاسی اور ظنی شے دین نہیں بن سکتی۔

(۲) اسلام میں یقینی چیز:۔

(ا) قرآنِ کریم ہے جو اپنے اصلی الفاظ میں بلاشک و شبہ ہمارے پاس موجود ہے اور قیامت تک اسی طرح موجود رہے گا۔ اور

(ب) وہ عملِ متواتر ہے جو نبی اکرمؐ سے لیکر آج تک امت میں نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے۔ مثلاً نماز روزہ۔ حج وغیرہ

(۳) نبی اکرمؐ نے قرآنِ کریم کو لکھوا دیا۔ حفظ یاد کرا دیا۔ اور اپنا پورا اطمینان فرما لیا کہ امت کے پاس یہ

صحیفۂ مقدسہ اپنے اصلی الفاظ میں محفوظ ہو چکا ہے۔

(۴) حضور نے کوئی مجموعہ احادیث نہ لکھوایا۔ نہ حفظ یاد کرایا نہ اس امر کا کوئی اہتمام کیا کہ امت کے پاس کوئی ایسا مجموعہ محفوظ رہے۔

(۵) خلفائے راشدینؓ نے قرآن کریم کی حفاظت و اشاعت میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کوئی احادیث کا مجموعہ مرتب کرایا نہ اس مجموعہ کی حفاظت و اشاعت کی۔

(۶) آج جس قدر کتب احادیث ہمارے پاس موجود ہیں ان میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کے متعلق دعوے کیا جاسکے کہ وہ رسول اللہؐ کی زبانِ اقدس کے ارشاد فرمودہ الفاظ ہیں۔

(۷) لہٰذا احادیث کا کوئی مجموعہ دین نہیں قرار پاسکتا۔ کیونکہ یہ ظنی ہیں۔ یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔

(۸) البتہ احادیث کے مجموعے صدر اول کی تاریخ ہیں جن کی تدوین میں انتہائی انسانی کوشش کی گئی۔ اور ان کی چھان بین میں عام کتب تاریخ سے بہت زیادہ دقتِ نظر سے کام لیا گیا۔ جن حضرات نے یہ محنت کی۔ امت ان کے احسانات کی شکر گذار ہے۔ ان میں جو چیزیں قرآنِ کریم کے مطابق ہیں وہ اس عہد سعادت عہد کی سچی تاریخ ہے جو نہیں ہیں وہ تحریف ہے۔

یہ ہے اجمالاً ان مضامین کا مفہوم۔ تفصیل ان مضامین کے مطالعہ سے سامنے آئے گی۔ ہم ایک دفعہ پھر گذارش کریں گے کہ آپ ان مضامین کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد اگر سمجھیں کہ ان کے دلائل کمزور ہیں تو ان کے رد میں خود لکھیے یا اربابِ علم و فضل سے لکھوائیے۔ طلوعِ اسلام کے صفحات ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں اگر کوئی صاحب ہماری واقعی غلطی ہم پر واضح کر دے گا تو ہم بلا ادنےٰ تامل اس سے رجوع کرلیں گے۔ اور ان کے شکر گذار ہوں گے۔ اگر اسے مغالطہ ہوگا تو اس کے ازالہ کی کوشش کریں گے۔ ہم نہ خود ضد پر اڑنا چاہتے ہیں نہ کسی سے کچھ بجبر منوانا چاہتے ہیں۔ ایک مسلک جسے ہم نے حق و صداقت کی راہ سمجھا ہے آپ کے سامنے رکھدیا ہے اسے خود بھی پرکھئے۔ اربابِ دانش و بینش سے پرکھوائیے۔ اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچئے۔ یونہی خفا ہو جانے سے تو کبھی جھوٹ سچ نہیں ہو سکتا۔

(۲)

آنے والا مورخ جب ہمارے زمانہ کی تاریخ لکھے گا تو وہ عجیب حیرت کے عالم میں ہوگا۔ وہ دیکھے گا۔ کہ ایک طرف انگریز اپنے سیاسی مستقبل کے مصالح کے پیش نظر مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہے۔ دوسری طرف ہندو۔ اپنی تنظیم۔ دولت۔ سیاسی خدع وفریب کے بل بوتے پر ہندو راج کے قیام میں کوشاں ہے اور اس نے دنیا کو دھوکا دینے کی خاطر چند نام نہاد مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی مساعی کو قومی آزادی کا نام دے رکھا ہے۔ پریس کی پوری قوت اس کے پاس ہے۔ پلیٹ فارم ہے۔ سرمایہ داروں کی پوری جماعت ہے۔ کام کرنے والوں کی فوج ہے۔ ایک کو ہماتمائیت کا چولہ پہنا کر مسجود امام بنا رکھا ہے۔ مرکز سے ایک بات اٹھتی ہے تو چاروں طرف سے اس کی تائید وحمایت میں شور مچادیا جاتا ہے۔ اس تمام شور وغوغا اور ہجوم مخالفت میں مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار ایک نحیف و لاغر انسان ہے جس کے پاس نہ قومی دولت کا انبار ہے۔ نہ سرمایہ داروں کا گروہ۔ نہ پریس اس کے پاس ہے۔ نہ پلیٹ فارم۔ نہ کام کرنے والوں کا لشکر ساتھ ہے نہ مشیروں کی جماعت۔ ایک فرد واحد۔ قلبی درد سے مجبور۔ اپنی خداداد ذہانت وتدبر کے زور پر۔ اپنی جیب سے خرچ کرکے اس تمام ہجوم مخالفت کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دو چار مخلص ساتھی جو کہیں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی آواز تشتت وانتشار کے صحرا میں کھو جاتی ہے۔ باقیوں کا یہ عالم کہ ساتھ اس لئے ہیں کہ

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

وہ اپنی وجاہت وثروت کے قیام وبقا کی خاطر پوری کی پوری قوم کو مع اس کے قائد اعظم کے بلا تامل بیچ دینے پر آمادہ۔ نہ صرف آمادہ بلکہ ہر وقت کوشاں۔

گاہ او را با کلیسا ساز باز　　گاہ پیش دیریاں اندر نماز

جو بلند آستانہ دیکھا۔ سر جھکا دیا۔ جو بڑی ڈیوڑھی نظر آئی جھولی پھیلادی۔

میری نگاہ نے جھک جھک کے کرئے سجدے　　جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

وہ اکیلا مردِ حق گو۔ انگریز کی شاطرانہ چالوں اور ہندو کی روباہ بازیوں کی مدافعت کرے یا آستین کے ان سانپوں سے قوم کو بچائے۔ ان تمام حالات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ اس ناخدائے کشتی ملت کو کون کونسی سطح آب سے ابھری ہوئی سنگین چٹانوں اور پانی کے نیچے چھپی ہوئی (Mines) کا خطرہ ہے اور ان خطرات کے باوجود وہ کس ہمت اور تدبر سے اس ٹوٹی ہوئی کشتی کو گرداب بلا سے بچاتا ہوا ساحلِ فلاح وسعادت کی طرف بڑھائے لئے جارہا ہے۔ اس لاغر وضعیف انسان کی اس بے پناہ ہمت کا راز اس کے سوائے اور کیا ہے کہ اسے اپنے مسلک کے حق وصداقت پر بے پناہ یقین ہے اور جمہور کا اسے پورا پورا اعتماد حاصل ہے۔

کیا آنے والے مورخ کے لئے یہ احوال وظروف تحیر انگیز نہ ہونگے!

---

(۳)

ہندوستانی سیاست کے معرکتہ الارا کارناموں میں ایک قابلِ یادگار وہ نعرۂ حق وصداقت بھی ہے جو راشٹر پتی ابو الکلام صاحب آزاد کے ایک تار کے جواب میں صدر مسلم لیگ کے قلبِ دردآگیں سے بلند ہوا اور جس نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں تموج پیدا کردیا۔ اس جواب کے متعلق اشاعتِ حاضرہ میں ایک مستقل مضمون الگ آپ کی نگاہوں سے گزرے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جناب آزاد کی حمایت و مدافعت میں جس قدر شور اٹھا سب مسلم قومیت پرست حضرات کی طرف سے تھا۔ کانگریس کے کسی ہندو لیڈر کی طرف سے ایک لفظ بھی اس کے متعلق نہیں کہا گیا۔ حالانکہ جناب آزاد ان کے بھی ایسے ہی صدر ہیں جیسے مسلم قومیت پرستوں کے بلکہ ہندوؤں کے زیادہ ہیں اس لئے کہ کانگریس ہی ہندوؤں کی جماعت۔ ہندو لیڈروں کی اس خاموشی کی وجہ ظاہر ہے اول یہ کہ وہ دل میں سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے اس پر خفا ہونے کی کونسی بات ہے دوسرے یہ کہ وہ ناراض اس لئے ہوں اگر کانگریس کے کسی سچ مچ کے صدر کی مزعومہ "بے عزتی" ہوئی ہو وہ مطمئن ہیں کہ ایک دنیا جانتی ہے کہ راشٹر پتی صاحب محض بساط سیاست پر شتر کی جگہ روڑا ہیں اس لئے یہ شور مچا کر کہ "صدر کانگریس" کی ہتک ہوئی ہے وہ خواہ مخواہ اس امر کا اقبال کیوں کریں کہ جناب آزاد سچ مچ کے صدر ہیں۔

لیکن ہندوؤں کی اس خاموشی کی وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جناب آزاد صاحب کو اس بات سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ یہی حقیقت جس کا اظہار مسٹر جناح نے ان کے متعلق کیا ہے۔ اگر کہیں گاندھی جی کے متعلق کرتے تو پھر آپ دیکھتے کہ یہ لوگ اسی طرح خاموش بیٹھے رہتے؟ کیا اس سے بھی آپ کے سامنے یہ حقیقت نہیں آئی کہ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ عزت سب اللہ اور اس کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہنے میں ہے۔

---

(۴)

اس بار مسئلہ خاکساران نے پھر ایک نئی کروٹ بدلی ہے۔ معاملہ کی نزاکت کے پیش نظر مسٹر جناح کے لئے مشکل ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی اس بیدردانہ تباہی اور بربادی کو خاموشی سے دیکھتے رہتے۔ چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق خاکساروں کے ارباب حل وعقد نے اپنے اختیارات کی حدود میں رہتے ہوئے اپنی شرائط ان کے سامنے رکھ دیں۔ اور عرض کر دیا کہ اگر آپ انہیں حکومت پنجاب سے تسلیم کرانے میں کامیاب ہو جا دیں تو بسم اللہ۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ۲۷ جولائی تک سول نافرمانی کے التوا کے بھی احکامات جاری کر رکھے ہیں۔ یہاں تک مسٹر جناح اور خاکساروں کی طرف سے جو کچھ ہوا ہے نہایت عمدہ ہے۔ ۲۷ جولائی تک کیا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ رسالہ کی اشاعت کا تقاضا یہی ہے لیکن جو کچھ قرائن سے نظر آتا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب مسٹر جناح کی بات نہیں مانے گی۔ جب سر سکندر حیات خاں صاحب خود جناح بننے کی فکر میں ہوں تو وہ جناح کی بات کیوں ماننے لگے۔ وہ جب لیگ کی مجلس عاملہ کی رکنیت کے باوجود لیگ کے ہر فیصلہ کی مخالفت میں فخر سمجھتے ہیں تو اس "غیر لیگی" مسئلہ میں کیوں جھکیں گے۔ خدا کرے ہمارے یہ قیاسات غلط ثابت ہوں اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ہاتھ سے یہی ایک بات مسلمانوں کے مفاد اور آرزو کے مطابق ہو جائے۔

یارب ایں آرزوئے ما چہ خوش است

لیکن گمان غالب ہے کہ ہمیں بالآخر یہی کہنا پڑے گا۔ کہ

کہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مطائبات

ایمان بالغیب

بولے کہ اُس خدا پہ جو آتا نہیں نظر ہے عقل سے بعید کہ ایمان لائیے
میں نے کہا کہ آپ کا کہنا بجا سہی لیکن ذرا وہ عقل تو مجھ کو دکھائیے

تفسیر بالروایات

دنیا میں رہا دین کا پردہ لیکر گمراہ کیا نام خدا کا لیکر
واعظ نے بھی افسانے سنائے کیا کیا قرآن کی آیت کا سہارا لیکر

غضِ بصر

لذت اندوزیٔ ارباب نظر کی خاطر چہرہ افروزی و گل پیرہنی ہوتی ہے
اے اسد تم جو نگاہوں کو جھکا لیتے ہو خود نماؤں کی بہت دلشکنی ہوتی ہے

اسد ملتانی

ختمِ نبوّت

پرویز

بچہ جب پہلے پہل چلنا سیکھتا ہے تو اُسے اُٹھنے کے لیے بھی کسی آسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دو چار قدم بمشکل چلتا ہے کہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ اِدھر اُدھر حسرت بھری نگاہوں سے مدد کی تلاش کرتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے تو رونے لگتا ہے۔ کوئی انگلی پکڑ کر اُٹھانے والا مل جائے تو پھر چار قدم چل لیتا ہے۔ اور بڑا ہوتا ہے تو گڈولنے کے سہارے چلتا ہے۔ وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے۔ اور آگے بڑھتا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ضرور ہو جاتا ہے لیکن چلتا پھرتا ان ہی مقامات میں ہے جن سے وہ مانوس ہوتا ہے۔ غیر مانوس مقامات کی طرف جانے سے گھبراتا ہے، کسی کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے۔ پھر اگر راستے میں کوئی چھوٹی سی نالی بھی آجائے تو اسے بحرِ بیکراں نظر آتی ہے۔ کہیں نشیب و فراز ہو تو وہ مصیبت کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ اور بڑا ہوتا ہے تو دن کی روشنی میں ہر طرف جا نکلتا ہے لیکن اندھیرے میں اسے چاروں طرف چھلاوے نظر آتے ہیں۔ اس وقت پھر کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب وہ پوری جوانی کو پہنچ جاتا ہے تو پھر اسے کسی انگلی پکڑنے والے کی احتیاج نہیں رہتی۔ مانوس و غیر مانوس مقامات کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ روشنی اور اندھیرے کا فرق باقی نہیں رہتا۔ اب وہ ہر جگہ بلا خوف و خطر چلا جاتا ہے۔ گرتا ہے تو خود اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی اٹھانیوالے کا انتظار نہیں کرتا۔ البتہ اس مقام پر اسے ایک چیز کی ضرورت یقینی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ راستے کی پُرخطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چیز جس کا وجود لاینفک اور جس کی احتیاج یقینی ہے۔ فقط اس قدر ہے کہ جہاں جہاں دوراہے آئیں وہاں سائن پوسٹ Sign Post لگے ہوں جن پر واضح اور بین الفاظ میں لکھا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور دوسرا کس طرف۔ اب اگر راہرو کی آنکھوں میں بصارت ہو اور فضا میں روشنی کہ جس کی مدد سے یہ سائن پوسٹ پڑھ سکے تو پھر راستہ قطع کرنے پر منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

افراد کی طرح نوعِ انسانی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ذہنِ انسانی کے عالمِ طفولیت میں اسے چھوٹے

چھوٹے معاملات کے فیصلے کے لیے بھی خارجی امداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ دو قدم بھی بغیر آسرے کے چل نہیں سکتا ہے۔ کسی کی شانِ ربوبیت سے بعید تھا کہ وہ بچے کو یوں تنہا چھوڑ دیتا۔ اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ یوں ہی بچہ گرے ایک انگلی پکڑ کر اُٹھانے والا پہنچ جائے۔ انسانی تمدّن و عمرانیت کے ابتدائی ادوار میں دیکھیے، ہدایت آسمانی کا سلسلہ کیسے غیر منفصل و متواتر چلا آتا ہے۔ ہر عہد میں رسول۔ ہر قریہ میں رسول، ہر قوم میں رسول۔ ایک رسول آتا۔ جب تک وہ اپنی قوم یا قبیلے میں رہتا لوگ رشد و ہدایت کی روشنی میں چلتے رہتے۔ جوں ہی وہ منہ موڑتا۔ وہ اس آسمانی روشنی کو گم کر دیتے۔ اور پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے پھرتے۔ مانوس مقامات کے جس قدر دھندلے سے نقوش ذہن میں محفوظ ہوتے۔ ان میں کہیں کہیں چل پھر لیتے۔ لیکن نہ حتمی طور پر صحیح راستے کا تعین کر سکتے نہ منزلِ مقصود کا اندازہ۔ ایسے میں پھر ایک اور رسول آجاتا۔ پھر روشنی سامنے ہوتی تو سیدھے راستے پر ہو لیتے۔ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا۟ فِيهِ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا۟ (ﭑ) جوں جوں نوعِ انسانی سن و سال میں بڑھتی گئی۔ رسالت و نبوت کا یہ وقفہ بھی زیادہ ہوتا گیا۔ رسول کے تشریف لے جانے کے بعد کچھ وقت تک اس کی اصلی تعلیم لوگوں میں باقی رہتی۔ پھر اس میں تحریف والحاق شروع ہو جاتا۔ آسرا کمزور پڑ جاتا۔ یہ مایوس ہو کر گر پڑتے۔ پھر کسی نئے سہارے کی طرف آنکھیں لگ جاتیں۔ پھر کسی آنے والے کا انتظار شروع ہو جاتا۔ یوں ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ذہنِ انسانی سنِ رشد و شعور کو پہنچ گیا۔ اس میں اب پختگی آگئی۔ بچہ اب جوان ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں منزل قطع کرنے کی طاقت۔ دل میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے حوصلے اور دماغ میں نشیب و فراز سمجھنے کی صلاحیت آگئی۔ اب ہر چار قدم پر گر کر کسی انگلی پکڑنے والے کی احتیاج نہ تھی۔ البتہ دوراہوں پر سائن پوسٹ کی ضرورت یقینی تھی اس کے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا کہ زندگی کی ہر شاہراہ پر۔ شاہراہ کے ہر موڑ پر ایسے ایسے محکم اور استوار پوسٹ لگا دیے گئے کہ حوادثِ زمانہ کے سیلاب آئیں، لیکن روشنی کے بلند میناروں کی طرح نشاناتِ الٰہی کے ان کھمبوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچے ہر شعبہ حیات کے اصول۔ ہر گوشۂ زندگی کے آئین۔ قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیے گئے۔ ان کی حفاظت و صیانت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ ساری دنیا کی قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ اس صحیفۂ خداوندی میں ایک نقطے کا بھی تغیر و تبدل کر سکیں تو ناکام و نامراد رہیں۔ اس لیے کہ جس کی حفاظت کی ذمے داری وہ ربّ السموٰت

والارض سے جوایسا حیّ وقیوم (زندہ و پائندہ) ہے کہ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (نہ جس کی آنکھ میں نیند آتی ہے نہ دماغ میں اونگھ) ۔ اس کی طرف کون آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے ۔ یہ محض ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں ۔ اپنے بیگانے اس پر گواہ ہیں جس کا جی چاہے مسلمانوں سے نہیں غیر مسلموں سے پوچھ لے ۔ ان کی شہادت کو پڑھ لے ۔ جو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ :-

"اگرچہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے ۔ تاہم صرف قرآن کریم ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردّ و بدل نہیں ہوا اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے ۔"

Bar o ness Margaratee Von Stein

جب راہرو جادۂ ہستی کی ضروریات یوں پوری ہوگئیں ۔ جب زندگی کی شاہراہوں پر ایسے ایسے محکم سائن پوسٹ نصب کر دیے گئے تو دین مکمل ہوگیا ۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا کہ انسانیت کی خودداری و خود اعتمادی کا تقاضا تھا کہ اب اسے بچہ نہ سمجھا جائے ۔ ضرورت صرف اس قدر تھی کہ اسے راستے بتا دیے جائیں ۔ نشانات لگا دیے جائیں ۔ فضا میں روشنی پیدا کر دی جائے ۔ اسے آنکھیں عطا کر دی جائیں اور کہہ دیا جائے کہ ان تمام چیزوں کی مدد سے ۔ وحی کی روشنی میں علم و عقل کی راہ نمائی سے ۔ مسائل حیات کے منازل طے کرے قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ صحیح اور غلط راستے متمیز و متفارق ہو گئے اِنَّا هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر دونوں راستے الگ الگ کر کے دکھا دیے گئے اور اسے چھوڑ دیا گیا کہ وہ ایک مردِ جواں ہمت کی طرح اپنا راستہ خود طے کرے ۔ اب ہر معاملے کے فیصلے کے لیے اصول اس کے سامنے ہیں ۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئی امور کے متعلق فرعی قوانین مرتب کرنے کے لیے علم و عقل اس کے پاس ہے ۔ معلّم کا کام صرف اصول سمجھا دینا تھا ۔ بنیادی قاعدے بتا دینا تھا ۔ اگر ہر جزوی سوال کا جواب بھی وہ خود ہی بتا دے تو متعلّم میں اصابتِ رائے ، قوت فیصلہ معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے کی صلاحیت کبھی پیدا نہ ہو سکے ۔ ذہن انسانی کو جلا دینے کے لیے اور اس کی نگاہوں میں بصیرت اور عقل و خرد میں نشو و ارتقا پیدا کرنے کے لیے چاہیئے ہی یہی تھا کہ اسے اصولوں کا مکمل ضابطۂ حیات دے کر ، کارگہ زندگی میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قوائے عقلیہ مضمحل ہو کے رہ جاتے عقل کا بچپن کبھی جوانی کی پختگی حاصل نہ کر سکتا ۔ کیا آپ نے اس لاڈلے نواب زادے

کا قصّہ نہیں سنا جو بارہ برس کی عمر تک ایک قدم بھی نہیں چلے۔ انّاؤں کی گود میں لدے لدے پھرتے رہے نتیجہ یہ کہ عمر بھر کے لیے ٹانگیں بے کار ہو گئیں۔ لہٰذا اگر انسانیت کے عہدِ طفولیت میں قدم قدم پر آسرے اور سہارے بہم پہنچانا ہی تقاضائے ربوبیت تھا تو جوانی کے زمانے میں اسے اپنے پاؤں چلنے دینا اس کے حق میں رحمت و شفقت تھا۔ اس کے قوائے عقلیہ کے بڑھنے۔ پھولنے پھلنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ اس کے جوہرِ مضمر میں جلا پیدا کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ نہیں! بلکہ یوں کہیئے کہ انسانیت کی خودداری کا یہی تقاضا تھا۔ کسی نوجوان سے بچوّں جیسا سلوک کیجیے۔ راستے میں اس کی انگلی پکڑ کر چلایئے۔ اسے گود میں اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔ دیکھیے اس کی خودداری کو کتنی ٹھیس لگتی ہے وہ کیسے انگلی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کس طرح گود سے اُچھل کر بھاگتا ہے۔ فرطِ ندامت سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھے گا۔ احساسِ خودی سے اس کی پیشانی عرق ریز ہو جائے گی۔ آپ نے اندازہ فرمایا کہ تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کس طرح اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر نبوّت کا دروازہ بند نہ کیا جاتا تو ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کبھی نہ کھلتیں۔ انسان اپنے پاؤں چلنا کبھی نہ سیکھتا یہ بچہّ کبھی جوان ہونے نہ پاتا۔

لیکن جو طبائع آسرے ڈھونڈھنے کی عادی ہو جائیں وہ عمر بھر آسرے ہی ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچےّ کو کسی اُٹھانے والے کا خیال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ گر پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے پاؤں چلتا رہتا ہے۔ کھیلتا کودتا ہے۔ اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہیں آتا کہ اسے کسی اُٹھانے والے کی ضرورت ہے۔ یہی کیفیت قوموں کی ہے۔ جب تک کوئی قوم سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتی ہے، جب تک وہ شوکت و حشمت، سطوت و حکومت کی مالک ہوتی ہے۔ جب تک اس کے سینے میں دل اور دل میں ایمان کی تڑپ، اس کے بازوؤں میں خون اور خون میں حرارتِ کردار موجزن ہوتی ہے۔ اس وقت تک اسے کسی آسرے کی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ کہیں سہارا نہیں ڈھونڈھتی۔ اُس وقت تو وہ خود بے آسروں کا آسرا اور بے سہاروں کا سہارا ہوتی ہے۔ اس کی قوّتِ بازو اس کے لیے آسرا اور نصرتِ ایزدی اس کا کافی سہارا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس قوم پر ادبار آ جاتا ہے اس کی دولت و حشمت چھن جاتی ہے۔ اس کی سطوت و حکومت لُٹ جاتی ہے۔ تو

اُس کے قوائے عملیہ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ظلمت کدۂ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی۔ اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اس کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس کی آرزوئیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ جہادِ زندگی میں سپر انداختہ شکست خوردہ بیٹھ جاتی ہے۔ وہ کش مکش حیات سے گھبراتی ہے۔ میدانِ عمل میں آنے سے گریز کرتی ہے۔ خطرات کا مقابلہ کرنے سے جی چراتی ہے۔ تو اُس وقت وہ کسی کمزور بچے کی طرح کسی اٹھانے والے کا انتظار کرنے لگ جاتی ہے۔ اس کی تمام توجہات کسی آنے والے کے پاؤں کی آہٹ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی اُمیدوں کا آخری سہارا "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے خوش آئند تصور میں تلاش کرتی ہے وہ ہر اُٹھتی ہوئی گرد کو ہزار حسرتوں سے دیکھتی ہے کہ شاید اسی میں وہ شہسوار دوراں چھپا چلا آرہا ہو جو اس کی نگہِ انتظار کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ غرضیکہ اُس وقت وہ قوم خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے ذہن کو اس خوش فہمی کے کھلونوں سے بہلاتی رہتی ہے کہ تھوڑی دیر اور ٹھہرو۔ آنے والا آئے گا اور تمام تباہ حالیوں اور بدبختیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے گا۔

اس "آنے والے" کا تخیل سب سے پہلے مجوسیوں کے ہاں ملتا ہے۔ وہ ایک بشارت لانے والے کے منتظر ہیں جو دنیا کو خاک کی اُفتادگی سے اُٹھا کر آسمان کی رفعت پر پہنچا دے گا اور ژند واستا کا وہ حصہ اپنے ساتھ لائے گا جو ہنوز انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اُس وقت خیر و شر کی ازلی جنگ ختم ہو جائیگی موت اور جہنم کا خاتمہ ہو جائے گا اور انسان ابدی مسرتوں اور سرمدی کیفیتوں کے جھولوں میں جھولیگا۔

ایران سے یہ عقیدہ آریوں کی وساطت سے ہندوستان میں آیا۔ چنانچہ ویدوں کی تعلیم کے مطابق وشنوجی نو مرتبہ اوتاروں کی شکل میں دنیا میں آچکے ہیں اور دسویں اوتار کی ہنوز انتظار ہے۔ یہ اس زمانے میں آئے گا جب دنیا سے ویدوں کی تعلیم اور منو شاستر پر عمل اُٹھ جائے گا، وہ دنیا سے رہزنی و سرقہ کو مٹا دے گا اور بد باطنوں کا خاتمہ کر دے گا۔

بدھ مت والے بھی ایک پانچویں بدھ کے انتظار میں ہیں جس کا لقب متیا ہو گا۔ یہ آخری زمانے میں آئے گا۔

یہودی ایلیا نبی کی آمد کے منتظر ہیں۔ عیسائیوں کو بھی ایک آنے والے کا انتظار ہے جو فلاح

وسعادت کا دور اپنے ساتھ لائے گا۔

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس عقیدہ کی اصل کیا تھی اور بعد میں اس سے کیا مفہوم لیا گیا۔ لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ جہاں جہاں اس آنے والے کا عقیدہ موجود ہے۔ اس آنے والے کا زمانہ قوم کی ذلت ونکبت کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد قوم کی زبوں حالی وسیاہ بختی عظمت وشوکت میں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کہ بچہ کسی انگلی پکڑنے والے کا انتظار اسوقت کرتا ہے جب وہ گر پڑتا ہے اور اس میں خود اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ دوڑتے کھیلتے کودتے اسے کسی سہارے کی تلاش نہیں ہوتی۔ لیکن ان قوموں میں ایک "آنے والے" کے عقیدے کی موجودگی متعدد وجوہ پر مبنی قرار دی جاسکتی ہے۔ مثلاً

(۱) ان قوموں میں جہاں جہاں آسمانی ہدایت آئی تھی اس سے مقصد تکمیلِ دین نہیں تھا۔ وہ وقتی ضابطۂ زندگی تھا اس لیے کچھ وقت کے بعد ایک جدید ضابطۂ حیات کا آنا ضروری تھا اس لیے ہر جانے والا بالعموم ایک آنے والے کی خبر دے جاتا تھا۔

(۲) آسمانی ہدایت کچھ عرصے کے بعد یا تو حوادث ارضی وسماوی سے مٹ جاتی یا انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہتی اور جب اس روشنی کے گم ہو جانے پر اندھیرا ہو جاتا تو ایک آنے والے کا انتظار پیدا ہو جاتا جس کے متعلق سمجھا جاتا کہ وہ چھنی ہوئی روشنی کو پھر سے واپس لے آئے گا۔

(۳) ایک رسول کے بعد جب دوسرا رسول آتا تو پہلے رسول کی امت اس نئے آنے والے سے سرکشی و بغاوت اختیار کرتی اور یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیتی کہ جس آنے والے کا انہیں انتظار ہے اس کی خصوصیتیں اس نئے والے میں پائی نہیں جاتیں۔ اس سے باہمی ضد شروع ہو جاتی اور اس ضد سے یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو جاتا کہ وہ آنے والا ان ہی خصوصیتوں کا حامل ہوگا جو اُن کے ذہن نے تجویز کر رکھی تھیں۔

یہ امم گذشتہ کی کیفیت تھی۔ لیکن ان تمام کے بعد اسلام آیا (یعنی وہ دین جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا) اور ادیان سابقہ سے ایک جداگانہ اسلوب و انداز سے آیا۔ اس میں ان وجوہات میں سے

کوئی ایک وجہ بھی موجود نہ تھی جن کی بنا پر کسی "آنے والے" کے عقیدے کی گنجائش نکل سکتی۔ یعنی اس نے اعلان کر دیا کہ یہ دین۔ انسانیت کو اس کے عہدِ شعور کے بعد دیا گیا ہے اس لیے اب کسی خارجی آسرے کی ضرورت نہیں۔ دین مکمل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی آنے والے کا کوئی ذکر نہیں۔

(۲) آسمانی ہدایت کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا گیا کہ نہ یہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ سکتی ہے نہ انسانی دستبرد اس میں کچھ تصرّف کر سکتی ہے

(۳) جب اس میں نہ کسی آنے والے کا ذکر موجود ہے نہ اس کی ضرورت باقی ہے تو کسی آنے والے میں متعینہ خصوصیات کی تلاش بھی بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسیلمہ کذاب نے دعویٰ نبوّت کیا تو کہیں مجلسِ مناظرہ منعقد نہیں کی گئی۔ کسی نے اس سے اس دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل نہیں طلب کی۔ کہ اس کی انہیں ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کی نگاہوں میں کسی آنے والے کا امکان ہی نہ تھا۔ اس لیے اُنہوں نے مسیلمہ کذاب سے وہی کچھ کیا جو ہر مسیلمہ کذاب کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔

لہٰذا اسلام میں تکمیلِ دین پر ایمان لانے کے بعد کسی آنے والے عقیدے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی

اس مقام پر دین کے متعلق ایک نکتے کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ایک چیز انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اور وہ کسی بلند و بالا ہستی کا وجدانی طور پر احساس ہے۔ اس وجدانی احساس کے اعتبار سے انسان شروع سے آخر تک یکساں چلا آتا ہے۔ لیکن اس وجدانی کیفیت کے علاوہ دوسری حالت اس کے ذہن کی ہے اور ارتقائے ذہنی کے لحاظ سے ابتدائی دورِ انسانیت گویا بچپن کا عہد ہے اور اس کے بعد جوانی کا زمانہ۔ دین کا وہ حصّہ جو انسان کے وجدانی جذبے کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا رہا ہمیشہ ایک رہا۔ قرآن کریم میں بھی وہی ہے جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا لیکن دوسرا حصّہ جو حیاتِ انسانی کے لیے اصولی ...... طور پر ایک ضابطے کا کام دے جو ذہنِ انسانی کی علمی نشو و ارتقاء کی پرورش و رہنمائی کرے۔ وہ قرآن کریم کے اندر آکر مکمل ہو گیا (اور قرآن سے باہر اور کہیں نہیں ہے)۔ وہ خدا جسے علم ہے کہ ذہنِ انسانی کی پرواز کی آخری حد کونسی ہے اس نے اس ضابطے کو اس انداز سے مکمل کر دیا کہ اس میں اب کسی اضافے۔ کسی تبدیلی۔ کسی تجدید

کی ضرورت و گنجائش باقی نہیں رکھی۔ ایک ایسے مکمّل ضابطے کا انسانوں تک پہنچانا نبوّت کا منصب تھا اور جب وہ منصب ادا ہو گیا۔ ضابطہ مکمل ہو گیا اور محفوظ کرکے رکھدیا گیا۔ تو پھر وہ کونسی ضرورت باقی ہے جس کے لیے سلسلۂ نبوت جاری رکھا جاتا۔ اور بلا ضرورت نبیوں کا بھیجتے چلے جانا۔ کم از کم خدائے حکیم و علیم کا کام تو ہو نہیں سکتا۔ یہ تو اس حکیم مطلق کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ اس وقت یہ بحث بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اسلام کس طرح ایک مکمل دین ہے اور تمام دنیا کے لیے صرف ایک دین اور ایک رسول کیسے کفایت کرسکتا ہے یہ ایک الگ عنوان ہے جسپر انشاءاللہ کسی دوسرے وقت میں لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ آج مختلف ایجادات نے زمان و مکان Time and Space کے بُعد کو مٹا کر زمین کی طنابیں اس طرح کھینچ دی ہیں کہ تمام کرۂ ارض ایک وحدت Unit ہو چکا ہے اور آپ ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تمام نوع انسانی تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اور ایک مرکز سے ساری دنیا کا نظام چلا سکتے ہیں۔ دنیا کی جغرافیائی حدود و بندیاں عہد کہن کی یادگار ہیں جب زمان و مکان کے بُعد پہاڑ بن کر حائل تھے۔ آج دنیا ان غیر فطری حدود و قیود سے خود گھبرا اُٹھی ہے اور کسی ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس سے یہ حدود ٹوٹ جائیں اور ساری دنیا ایک وحدت Single Unit میں تبدیل ہو جائے یورپ کے ماہرین سیاست اس نظام کا خاکہ ایک عالمگیر فیڈریشن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر حال ہی میں ایک مختصر لیکن مفید کتاب Federation and World Order شائع ہوئی ہے جس کا دیباچہ مشہور ڈاکٹر جوڈ Joad نے لکھا ہے وہ یہ بتانے کے بعد کہ دنیا زمان و مکان کی حدود کو توڑ کر کس طرح ایک وحدت بن رہی ہے۔ لکھتا ہے:۔

"بعد مکانی مٹ جانے کے بعد۔ انسانی عمرانیت و مدنیت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ محیر العقول ہیں۔ بایں ہمہ جہاں ہمارا عمرانی نظام ہمارے اسلاف سے اس قدر مختلف ہو چکا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام ابھی تک وہی چلا آتا ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک بڑا عظم بن چکی ہے لیکن دنیا میں قومی حکومتوں کی حدود و قیود بدستور قائم ہیں (اس بوالعجبی کو مٹانے کے لیے) ایک بدیہی طریق کار یہی ہے کہ کوئی ایسا نظامِ زندگی وضع کیا جائے جس سے یہ حدود

وقیود مٹ جائیں)"

دیکھیے دنیا کس طرح رفتہ رفتہ اسلام کے قریب آ رہی ہے۔ اسلام کا مطمح نگاہ انسانی وحدت ہے اس لیے وہ تمام بنی نوع انسانی کے لیے ایک ہی نظامِ زندگی (دین) تجویز کرتا ہے۔ جسے ضابطۂ الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خدا کو رب العالمین (تمام نوع انسانی کا رب) رسول اکرمؐ کو رحمت للعالمین (تمام نوع انسانی کے لیے موجبِ رحمت) اور قرآن کریم کو ذکر للعلمین (تمام نوعِ انسانی کے لیے یاددہانی کا ضابطہ قرار دیا ہے۔

بہرحال یہ اجمالی اشارے ہیں۔ تفصیل ان کی کسی دوسرے موقع پر سہی - وہ توفیق الا باللہ العلی العظیم۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس عقیدہ کے بعد کہ دین مکمل ہو گیا اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالٰے نے لیا۔ کسی "آنے والے" کے تصور کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن جہاں مسلمانوں میں اور ایسے متعدد عقائد آگئے جن کا قرآن کریم میں کہیں ذکر تک نہیں۔ ان کے ساتھ ایک "آنے والے" کا انتظار بھی ان کے پیچھے لگ گیا یعنی دین مکمل۔ ضابطۂ خداوندی محفوظ اور ایک آنے والے کا انتظار!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ختمِ نبوت کے بعد امامت اور ولایت کے منصوص ہونے کا عقیدہ شیعہ حضرات نے پیدا کیا (مجھے اس وقت اس عقیدے کی دینی حیثیت سے بحث نہیں) یہ پہلی کھڑکی تھی جو "آنے والوں" کے لیے کھولی گئی۔ انہوں نے امامت کو حضرت علیؑ کی نسل میں متوارث قرار دیا۔ یہ سلسلہ بارہ پشتوں تک جاری رہا اور اس کے بعد بارہویں امام حضرت محمد بن عسکریؒ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ عراق کے ایک تہ خانے میں زندہ موجود ہیں۔ یہی امام آخر الزماں ہیں جو آخری وقت میں ظاہر ہونگے۔ شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ تو اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک امام منصوص کی موجودگی ضروری ہے۔ سطح ارض پر نہیں تو کسی غار کے اندر ہی سہی۔ دنیا امام سے خالی نہیں رہ سکتی لیکن حیرت ہے غیر شیعہ حضرات پر کہ وہ ختمِ نبوت کے بعد کسی امام منصوص کے قائل نہیں لیکن ایک

"آنے والے" کا انتظار اسی طرح کر رہے ہیں جس طرح شیعہ حضرات - ہر چند شیعہ حضرات کی طرح اس آنے والے کو یہ امامِ غائب نہیں مانتے لیکن اس آنے والے کی بعثت کا زمانہ ایسا ہی رکھا گیا ہے جیسا ہم دیگر ادیان و اقوام کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ یعنی جب مسلمانوں کی ذلت و خواری انتہا تک پہنچ جائیگی تو ایک انگلی پکڑ کر اٹھانے والا آئے گا اور ساری دنیا پر مسلمانوں کی سلطنت قائم کر دے گا انہیں خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی سب کچھ وہی کر دے گا۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ اس عقیدہ نے قوم کی نفسیاتی کیفیت پر کس قدر گہرا اثر ڈال رکھا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس قوم میں "آنے والے" کا عقیدہ رہا وہ قوم ایک دفعہ گرنے کے بعد پھر ابھری ہی نہیں۔ پارسی، یہودی، ہندو، بدھ، عیسائی ہر ایک کی یہ حالت ہوئی کہ انہیں گر کر اٹھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ (یورپ کے "عیسائی" نے جب دنیاوی ترقی کی ہے تو نہ صرف اس عقیدے کو بلکہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر کی ہے)۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہوئی۔ ایک دفعہ گرے تو پھر سنبھلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس لیے کہ اس "آنے والے" کو نبوت کی طرح اُن وہبی کمالات کا حامل سمجھا جاتا ہے جن میں کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے قوم کسب و ہنر یعنی قوائے عملیہ کو بروئے کار لانے کی طرف سے یکسر غافل ہو جاتی ہے اور سمجھ لیتی ہے کہ جب ہمارے بنانے سے کچھ بن نہیں سکتا تو ہم مفت کی تگ و دو میں کیوں سر کھپائیں۔ وہ آنے والا خدائی قوتوں کو ساتھ لے کر آئے گا اور خود ہی سب کچھ کر دے گا۔ حالاں کہ قرآن کریم نے اس امر کو نہایت واضح طریق پر بیان کر دیا ہے کہ ایک نبوّت تو ملکۂ وہبی ہے۔ اس کے علاوہ ہر مرتبہ اکتساباً حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کسب و ہنر کے ساتھ فضل ایزدی کا شریکِ حال ہونا بھی ضروری ہے لیکن فضل خداوندی بھی ایمان و اعمال صالحہ سے ہی مشروط ہے۔ اُمتِ مسلم کو یہ فلک پیما مدارج کس طرح حاصل ہوں گے۔ اس کا پورا انتظام قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ قرآن کریم نے بصراحت فرما دیا کہ ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے (النور) اور اس استخلاف فی الارض یعنی حکومت الہیّہ کے قیام کا مقصد امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یعنی دنیا میں قانونِ فطرت (ضابطۂ خداوندی) کے مطابق احکامات نافذ کرنا اور غیر فطری (یعنے غیر قرآنی) امور کو روک دینا۔ ایمان و اعمال صالحہ سے استخلاف فی الارض اور استخلاف فی الارض سے ایمان و اعمال صالحہ۔ یہ ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جو کبھی ٹوٹتا

ہی نہیں۔ اسلام مومنین کی جماعت پیدا کرتا ہے کہ حضرات انبیا کرامؑ کے بعد میزانِ خداوندی میں سب سے گراں قدر مرتبہ مومنین کا ہے۔ انہی میں مجاہد ہوں گے۔ انہی میں شہدا ہونگے۔ انہی میں صدیق ہونگے۔ یہی وہ جماعت ہے جس کی قوتِ بازو زمین پر آسمانی بادشاہت کے قیام و بقا کی کفیل ہوگی۔ انہی کے متعلق قرآنِ کریم نے فرمایا کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ ۲۲/۴۱

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں دنیا میں تمکن و غلبہ عطا فرمائیں گے تو وہ نماز کو قائم کردینگے زکوٰۃ دیں گے۔ امورِ معروف کا حکم نافذ کریں گے اور امورِ منکر کو روکیں گے۔ اور انجام کار اللہ ہی کے لیے ہوگا۔

عدم گنجائش مانع ہے ورنہ میں اس آیۂ مقدسہ کی تشریح میں عرض کرتا کہ ایک "خدائی قوم" (حزب اللہ) کی اندرونی تنظیم و تقویت کے لیے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا پروگرام کس قدر شاندار ہے اور پھر اس کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ دورِ حاضرہ کی جہنم زار دنیا کو کس قسم کی جنت بنا دینے کا ذمہ دار ہے اس وقت صرف اتنا دیکھیے کہ اس جماعت کا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرار دیا گیا ہے۔ اور اس مقصدِ جلیلہ کے لیے پوری کی پوری قوم کو تیار کیا جاتا ہے۔ فرمایا:۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ۳/۱۰۹

تم سب سے بہتر قوم ہو جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔

یہ پوری کی پوری قوم کا نقشہ ہے۔ اب اس قوم کے منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ ہوگی۔ اور ان میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ان کا مرکز (امیر المومنین) ہوگا۔ یہ وہ حضرات ہونگے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت کا مہدی اور اپنے اپنے زمانے کا مجدد ہوگا اور یہ سلسلہ غیر منقطع ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں میں جب

تک یہ سلسلہ قائم رہا کسی کو کسی "آنے والے" مہدی و مجدد کا خیال تک بھی پیدا نہ ہوا۔ اس لیے کہ اٹھانے والے کا خیال تو پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب بچہ گر پڑتا ہے۔ لفظ مجدد کی ابتدا عجیب اتفاق سے ہوئی۔ بنی امیہ کے عہد میں استبداد و تغلب بڑھ گیا۔ پہلی صدی کا آخیر تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ مقرر ہوئے، اُنہوں نے اس تغلب و استبداد کو مٹا کر حکومت کو پھر سے خلافتِ راشدہ کے خطوط پر منتقل کیا۔ اُس آئینِ کہن کی تجدید کی۔ بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد دلایا۔ مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کیا۔ اس کارنامۂ احیاء و تجدید کی بنا پر مجدد کہلائے۔ لیکن اس کے بعد یہ تصور ایک سلسلۂ جاریہ Regular Feature کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ چوں کہ پہلی صدی کے آخیر پر خلیفہ ہوئے تھے اس لیے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ ہر صدی کے آخیر پر ایک مجدد آیا کرے گا۔ یعنی بجائے اس کے کہ یہ خیال پیدا ہوتا کہ اب اگر آئینِ خداوندی کا پھر سے قیام ہو چکا ہے تو اس سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا جائے اور مجدد و مہدی ہر وقت موجود رہیں۔ خیال یہ پیدا ہوا کہ نہیں۔ اس مجدد کے بعد یہ سلسلہ پھر بگڑے گا۔ سو سال تک بگڑتا جائے گا۔ اس کے بعد پھر ایک مردِ مومن پیدا ہو گا اور آئینِ خداوندی کی تجدید کرے گا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس سلطنت و حکومت تھی۔ قوت و حشمت تھی۔ اسی لیے اُنہوں نے حکومت الٰہیہ کی تجدید کی لیکن بعد کے آنے والے مجددین حضرات کے لیے یہ شرط بھی ضروری نہیں رہی۔ بعد میں اسلام چوں کہ چند عبادات و عقائد کے مجموعے کا نام رہ گیا تھا اس لیے ان ہی عقائد کی اصلاح کا نام احیاء و تجدید تھا۔ اب ذرا اس نظام کو تصور میں لائیے کہ، مثلاً آج ساری دنیا میں چالیس پچاس کروڑ مسلمان ہیں۔ سو سال کے عرصے میں جس قدر مسلمان آئیں گے اور چلے جائیں گے ان شمار بھی سامنے رکھیے۔ اس کے بعد دیکھیے کہ سو سال کے عرصے میں اس قدر لا تعداد مسلمانوں میں "آدمی" صرف ایک پیدا ہوتا ہے جس قوم کی "آدمی" پیدا کرنے کی رفتار Progress of Production یہ ہو اس قوم کا خدا حافظ۔ دنیا کی زندہ قوموں پہ نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں بیک وقت کس قدر ذہین و فطین Genius انسان موجود ہوتے ہیں اور اس کے بعد پھر مسلمانوں کو دیکھیے کہ جن کی تمام کائنات میں کہیں سو سال میں جا کر ایک "آدمی"

پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی چند مسائل کی تجدید کر کے چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ وہ زندہ رود تھی جس کی روانی میں کبھی سست رفتاری پیدا نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ چہ جائیکہ یہ خشک ہو کر یوں سراب بن جائے۔ اور پھر وہ "آنے والا انسان" بھی قوم کا پیدا کردہ نہ ہو بلکہ وہی کمالات کا حامل ہو۔ اس عقیدے کی علمبردار قوم کی جو حالت ہونی چاہیئے اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ صورت ببیں۔ حالم مپرس۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ "آنے والے" کا انتظار اس وقت ہوتا ہے جب قوم میں بڑھنے اور زندہ رہنے کی قوت باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اس درجہ شکستہ بازو ہو چکی ہو۔ اس کی متاعِ حیات ایک خوانِ یغما بن جاتی ہے کہ جس کا جی چاہے چھین جھپٹ کرے جائے۔ ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کس قدر رہزنِ ایمان و آگہی اس "آنے والے" کے عقیدے کے چور دروازے سے آئے اور خرمنِ ملّت کے لیے کس درجہ غارت گر واقع ہوئے۔ عہدِ گزشتہ کے مدعیان کو چھوڑیے۔ عصرِ حاضر میں ایران کے سید علی محمد باب اور مرزا حسین علی بہاء اللہ مہدویت کے اسی راستے سے نبوت اور پھر مظہر الوہیت کے ادعائی مقام تک جا پہنچے۔ پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب کو بھی یہی دروازہ کھلا نظر آیا اور وہ بھی دبے پاؤں مجدّدیت۔ مہدویت۔ مسیحیت کی منازل طے کرتے کرتے نبوّت کی چوٹی تک جا پہنچے۔ ہمارے مولوی صاحبان پچاس برس سے ان کے ساتھ مناظرے، مباحثے، مجادلے، مباہلے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ مولوی صاحبان خود ایک آنے والے کے انتظار میں ہیں اور بحث کا مدار روایات و آثار پر رہتا ہے جن میں مخالف و موافق دونوں کو اپنے دعاوی کی تائید میں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ اگر بحث کا مدار قرآنِ کریم ہوتا تو مسئلہ اتنا طول نہ کھینچتا۔ قرآنِ کریم میں کسی آنے والے کا ذکر نہیں۔ باقی رہا ختمِ نبوت کا مسئلہ سو قرآنِ کریم کو مکمل و محفوظ ماننے کے بعد اجرائے نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر کسی نبی کا آنا کیسا! اسی لیے قرآنِ کریم نے نبی اکرم کے متعلق فرما دیا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ ۲۸/۳۴

اور ہم نے تمہیں تمام نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

پھر یہ واضح کرنے کے لیے کہ کافتہ للناس "میں صرف نبی اکرمؐ کے زمانے کے انسان ہی شامل نہیں بلکہ قیامت تک کے آنے والے انسان .... شامل ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۶۲/۲-۳

اللہ وہ ہے جس نے ان ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیات سناتا ہے اور ان کا تزکیہ (قلوب) کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے اور (صرف انہی کی طرف نہیں جو نزولِ قرآن کے وقت مخاطب تھے بلکہ) **ان لوگوں کی طرف بھی جو بعد میں آنے والے ہیں** (ان سے ابھی ملے نہیں)

مرزا صاحب قرآنِ کریم کی اکملیت وحفاظت کا تو انکار کر نہیں سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے دعوئے نبوت کی ایک اور راہ نکالی۔ یعنی انہوں نے کہا کہ میں نبی تو ہوں لیکن کوئی کتاب نہیں لایا۔ حالاں کہ قرآن کریم نے صاف صاف کہدیا ہے کہ کوئی نبی بغیر کتاب کے آ ہی نہیں سکتا۔ جب کوئی چٹھی نہیں تو "چٹھی رساں" کے آنے کا کیا مطلب۔ فرمایا

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۲/۲۱۳

چونکہ تمام نوعِ انسانی ایک امت واحدہ ہیں[1]۔ سو اللہ نے انبیا کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ **(مَعَهُمْ) کتابیں حق کے ساتھ نازل کیں** ۔ تاکہ وہ لوگوں کے امور مختلفہ فیہ کا فیصلہ کریں۔

یہاں النبیین (انبیاء) فرمایا۔ دوسری جگہ رسول کہا۔

---

[1] اس آیت کے اتنے حصے کی تشریح کسی دوسرے وقت بیان کی جائے گی۔ منہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ ۲۵/۲۵

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل واضح دے کر بھیجا اور ان سب کے ساتھ (مَعَهُمْ) کتابیں نازل کیں۔

مَعَهُمْ (سب کے ساتھ) میں کسی نبی اور رسول کی استثنا نہیں اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کہ رسولوں کا تو فریضہ ہی پیغام الٰہی کا پہنچانا ہے (وما علی الرَّسُولِ اِلَّا الْبَلَاغ)۔ کتاب کا سکھانا ہی (یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَاب)۔ تو جب پیغام و کتاب ہی نہ ہو تو پھر پیغام بر اور معلم کو آنے سے کیا مقصد! کہتے ہیں کہ دیکھیے حضرت ھارون ع رسول تھے لیکن کتاب کے بغیر۔ کیوں کہ توریت تو حضرت موسیٰ ع پر نازل ہوئی تھی۔ حالاں کہ قرآن خود اس پر شاہد ہے کہ توریت حضرت موسیٰ ع و ہارون ع دونوں کو دی گئی تھی۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔ ۲۱/۴۸

اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ھارون کو الفرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی) اور روشنی اور متقیوں کے لیے نصیحت (کی کتاب) عطا کی۔

اور پھر لطف یہ کہ اس نبوّت کو مرزا صاحب وہبی نہیں بلکہ اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ نبوت نہیں جو خدا سے ملے بلکہ وہ نبوت جو دوسرے نبی سے حاصل کی جائے۔ اور اس کی سند "خاتم النبیّین" سے لاتے ہیں۔ یعنے جس "خاتم النبیّن" سے اُمّت قرونِ اولےٰ سے آج تک اختتام نبوت سمجھتی چلی آئی ہے۔ اور جس پر خود قرآنِ کریم شاہد ہے۔ اسی "خاتم النبیّن" سے مرزا صاحب اجرائے نبوّت ثابت کرتے ہیں اور اپنی نبوت کی دلیل لاتے ہیں۔ "خاتم النبیّن" کے معنی ہیں "نبیوں کی مُہر" مرزا صاحب اس کے معنی لیتے ہیں وہ شخص جس کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن جائیں۔ قرآنِ کریم میں خَاتَمْ کا لفظ تو کسی دوسری جگہ استعمال نہیں ہوا لیکن اسم کے معنوں میں ختام اور فعل کے معنوں میں ختم۔ یہ ختم کئی جگہ آیا ہے ان مقامات سے خود معلوم ہو جائے گا کہ خاتم۔ ختام اور ختم کے معنی کیا ہیں۔ سورہ تطفیف میں جنت کی شراب کے متعلق ہے "رَحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ" یعنی سربمہر شراب[1] جسے انگریزی میں Sealed کہا جاتا ہے۔ اس سے

---

[1] نشہ آور دنیا کی شراب نہیں۔ بلکہ قلب و نظر کے نور اور روح کے سرور کی جنتی شراب۔ منہ

آگے ہو۔ ختامہ مسک ۔جس کی مہر مشک کی ہے یعنی بالکل واضح ہیں کسی چیز کو بند کر کے اس پر جو مہر Seal لگائی جاتی ہے اسے ختام کہتے ہیں اور وہ شے مختوم Sealed ہو جاتی ہے ۔ختم اللہ علی قلوبھم متعدد بار آیا ہے ۔جس کے معنی دلوں پر مُہر کر دینے کے ہیں۔یعنی وہی جو دوسری جگہ طَبَعَ اللہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ کے الفاظ میں آیا ہے ۔یا اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ (یٰسین) اس دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دینگے یعنی بالکل واضح ہیں ۔ختم علی سمعھم (اس نے ان کے کانوں پر مُہر لگا دی) کے معنی بھی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں ۔چنانچہ دوسرے مقام پر ہے وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْ اٰذَانِہِمْ وَقْرٌ (فصلت) ۔جو ایمان نہیں لائے ہم ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیتے ہیں دیکھیے ہر مقام پر ختم ۔ ختام ۔کے معنی بند کرنے کے ہیں۔ پانچ چار برس اُدھر کا ذکر ہے ۔مرزائی حضرات کو جب مسلمانوں کی لغت کی کتابوں سے خاتم النبیّن کے معنی اپنے مطلب کے مطابق نہ مل سکے تو اُنہوں نے امریکہ کے مشہور مسلم آزار مسیحی رسالہ "مسلم ورلڈ" کے ایڈیٹر پادری زویمر سے استفسار کیا کہ اس کی تحقیق کے مطابق خاتم النبیّن کے کیا معنی ہیں ۔ان حضرات نے اسی لیے پادری صاحب کی طرف رجوع کیا ہوگا کہ وہاں سے حسبِ مطلب معانی مل جانے کی توقع ہوگی ۔لیکن وہ جو کہتے ہیں :۔

اگر صد سال گبر آتش فروزد ۔۔۔ اگر یکدم در وافتد بسوزد

پادری صاحب نے صاف کہدیا کہ صدر اولیٰ سے آجتک کسی نے خاتم النبیین کے معنی سوائے "آخری نبی" اور کچھ نہیں لیے ۔"یہ نبی گر" کے معنی تو خالص قادیانی ٹکسال کی ایجاد ہے ۔لیکن حیرت ہو کہ ان حضرات کو سات سمندر پار جانے کی کیا ضرورت تھی ۔پہلے خود اپنے گھر میں کیوں نہ جھانک لیا ۔خود قادیان سے عربی۔ اردو کا ایک لغت (تسہیل العربیہ) شائع ہوا ہے اس میں خاتم کے معانی لکھے ہیں "انگوٹھی ۔سٹیمپ ۔ہر چیز کا انجام" وہی معانی جو لغت کی پرانی کتابوں میں "ما یختم بہ الشئ" جس سے کسی چیز کا اختتام ہو جائے) کے الفاظ میں پائے جاتے ہیں ۔مجازاً نگینہ دار انگوٹھی کو بھی خاتم کہتے ہیں ۔کیونکہ نگینے میں مہر کھدی ہوتی ہے اور مہر سے تحریر کی تکمیل ہو جاتی ہے ۔لغت کے علاوہ اگر قرآنی مفہوم کے مطابق بھی لیا جائے تو خاتم النبیین کے یہ معنی کہ "جسکی متابعت سے دوسرا شخص نبی بن سکتا ہو" قرآن کریم کے بالکل خلاف جاتے

ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ نبوت ایک وہبی شے ہے یعنی نبوت کسی شخص کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس منصب جلیلہ کے لیے جسے منتخب کر لیتا ہے اسے نبوت عطا کر دیتا ہے۔ (اللہ اعلم حیث یجعل رسٰلتہ ۱۲۴/۶) یہی وجہ ہے کہ نبوّت ملنے سے پیشتر خود نبی کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ نبی اکرمؐ کے متعلّق فرمایا،

وَمَاكُنْتَ تَدْرِي مَاالْكِتَابُ وَلَاالْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا. ۵۲/۴۲

(اس سے پیشتر) تجھے خبر بھی نہ تھی کہ الکتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ایک نور بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ ھدایت دکھا دیتے ہیں۔

یعنی جو چیز وہبی طور پر ملتی ہے اس کے متعلق اس شخص کو بھی علم نہیں ہوتا جسے وہ شے ملنے والی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جو چیز انسان اپنے کسب و ہنر سے حاصل کرتا ہے اس میں کسب و محنت کرنے والے کو اپنی ترقی **Progress** کا علم ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے کہ اب میں نے اتنا کچھ حاصل کر لیا۔ اب منزل اتنی دور رہ گئی۔ اب قریب آگئی۔ اب میں اس تک پہنچا ہی چاہتا ہوں۔ نبوّت کا یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ نبوت کا عطا کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر خاتم النّبیین کے یہ معنی لئے جائیں کہ رسول اللہؐ ایسے نبی ہیں جنکی "مہر تصدیق" سے دوسرے لوگ بھی نبی بن سکتے ہیں تو اس سے نبوت تقسیم کرنے کا اختیار خود نبیؐ اکرم کو حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تعلیم بھی یکسر خلافِ قرآن ہے اگر کہا جائے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیؐ اکرم کے اتباع سے انسان نبی بن جاتا ہے تو اس سے نبوت اکتسابی شے بن جاتی ہے اور جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے نبوت کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

ایک دلچسپ دلیل اور بھی سنیئے سورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے کہ وہ دعا مانگیں اھد نا الصراط المستقیم۔ اور صراط مستقیم کے متعلق ارشاد ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ان لوگوں کی راہ جن پر اللہ نے اپنا انعام کیا ہے) اور دوسری جگہ ہے کہ:

وَمَن يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ	جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا تو یہ لوگ
الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ	ان کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے
الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ	یعنی انبیاء، صدیقین، شہدار اور صالحین۔ اور
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۴/۶۹	یہ کیسے اچھے رفیق ہیں۔

اس دلیل سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے۔ (۱) جس طرح صدیق، شہدار، صلحا کے راستے پر چل کر ایک مومن خود صدیق صالح، شہید بن سکتا ہے اسی طرح انبیا کے راستے پر چل کر وہ نبی بھی بن سکتا ہے۔

یا (۲) جس طرح صدیقین، شہدار، صلحار کی معیت (ساتھ ہونے) سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مرد مومن خود صدیق، شہید، صالح ہو اسی طرح انبیار کی معیت کے یہ معنی ہیں کہ وہ نبی بھی ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے یہ دلیل اور اس سے اخذ کردہ نتائج دونوں غلط ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ جس راستے پر کوئی چلتا ہے وہ خود بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں صراط مستقیم پر چلنے کی دعا ہر مسلمان کو سکھائی گئی ہے اور صراط مستقیم کے متعلق اسی قرآن میں ہے کہ:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۱۱/۵۶ بیشک میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔ (نیز ۴۶/۳۰)

یعنی صراط مستقیم خود خدا کی راہ ہے۔ اللہ خود صراط مستقیم پر ہے۔ تو اگر یہ دلیل صحیح مانی جائے کہ جو جس کے راستے پر چلتا ہے وہ خود بھی وہی کچھ بن سکتا ہے۔ تو صراط مستقیم پر چلنے والے انسان کو خدا بھی بن جانا چاہیئے (نعوذ باللہ من ذالک)۔

اب لیجئے دوسرا نتیجہ یعنی جو جس کی معیت میں ہوتا ہے وہ خود بھی وہی کچھ بن سکتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشداء علی الکفار۔ الخ (محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھی ہیں، کفار کے مقابلے میں سخت ہیں .....) تو اس دلیل کی رُو سے یہ ماننا پڑے گا کہ نبی اکرمؐ کی معیت میں جس قدر صحابہ کبارؓ تھے سب کے سب نبی تھے۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ قرآن کریم میں ہے۔ ان اللہ مع المومنین۔ ان اللہ مع الصابرین۔ (بیشک اللہ مومنین اور صابرین کے ساتھ ہے۔) بلکہ یہاں تک هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو)۔ تو اگر یہ دلیل

صحیح مانی جائے کہ جو جس کی معیت میں ہوتا ہے وہ وہی کچھ بن سکتا ہے تو تمام مومنین بلکہ تمام انسان (نعوذ باللہ) خدا بھی بن سکتے ہیں۔ اور اگر نبی کی اطاعت سے انسان نبی بن سکتا ہے تو اسی منطق کی رُو سے، خدا کی اطاعت سے انسان کو (معاذ اللہ) خدا بھی بن جانا چاہیئے۔ یہاں آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کی اطاعت سے انسان خدا نہیں بن سکتا بلکہ وہ صرف اتنے ہی مدارج طے کر سکتا ہے جتنے مدارج کی بابت قرآنِ کریم میں تصریح ہے۔ اسی طرح نبی کی اطاعت سے بھی انسان نبی نہیں بن سکتا کہ نبوت تو ختم ہو گئی۔ نبوت کے نیچے جتنے اور مقامات ہیں جن کی تصریح قرآن کریم نے بیان فرما دی ہے ان مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔

چونکہ یہ بحث ذرا اصطلاحی سی ہو گئی ہے اس لیے قرآنی تعلیم کو ایک مرتبہ پھر دُہرا لیجئے۔ یعنے

(۱) قرآنِ کریم مکمل ... اور محفوظ ہے۔ (دین کی تکمیل کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالےٰ نے لیا ہے)۔ اس لیے قرآن کریم کے بعد کسی جدید کتاب کی ضرورت نہیں۔

(۲) رسول یا نبی خدا کی کتاب لے کر ہی آتا ہے کوئی رسول یا نبی بغیر کتاب کے نہیں آتا۔ (جس طرح قرآن کریم نے چند ایک رسولوں کا ذکر فرمایا اور باقیوں کی نسبت کہہ دیا کہ لم نقصص ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح چند ایک کتابوں کا بھی ذکر فرما دیا اور باقیوں کا ذکر نہیں کیا۔ نہ "کتاب" کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ضخیم و جسیم کتاب ہو۔ مختصر سے احکام کا مجموعہ بھی کتاب ہو سکتا ہے)

(۳) جب نبی بغیر کتاب کے نہیں آسکتا اور کتاب کی اب ضرورت نہیں تو نبی کی بھی ضرورت نہیں۔ لہٰذا قرآن کریم آخری کتاب اور نبی اکرمؐ خدا کے آخری رسول ہیں۔

(۴) نبوّت وہبی شے ہے۔ کسب و ہنر سے نہیں ملتی۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کی متابعت سے نبوت نہیں مل سکتی۔

(۵) جیسے خدا کی اطاعت و معیت سے انسان خدا نہیں بن سکتا اسی طرح نبی کی اطاعت و معیت سے وہ نبی نہیں بن سکتا اطاعت سے وہی کچھ بن سکتا ہے جس کے بننے کا امکان ہو۔

رسول اللہ ؐ کے بعد نبوت کا امکان ہی نہیں رہا۔

(۶) قرآنِ کریم میں کسی آنے والے کا ذکر ہی نہیں۔ اس لیے کسی آنے والے کا انتظار ہی غلط ہے

پھر دیکھیے کہ اس "نبوت" یا "مجددیت" نے قوم کو دیا کیا؟ نبوت کا مقام تو اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں نور، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی، اور کائنات کے ایک ایک ذرّے میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی کا پیغام دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی مخاطب قوم کو زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔* وہ اپنی ہوشربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں کھود کر آئینِ کائنات کو...... ضابطۂ خداوندی کے خطوط پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس کی بعثت سے ایک نئی دنیا وجود میں آجاتی ہے۔ خاک کے ذرات سے ایک جہانِ نو اُبھرنے لگتا ہے۔ زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں روح کی مسرتوں کے چشمے اُبلتے ہیں۔ قلب و جگر کی نورانیت کے شگوفے پھوٹتے ہیں تازہ امیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹخنتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن۔ دامانِ باغبان وکفِ گل فروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہیٰ ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ جلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتشکدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ جب اعلائے کلمۃ الحق کے لیے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلوں میں

*قرآن کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے

چلتی ہے۔ سرکش وخود پرست قومیں اس کے خدا کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے اس کے ان انقلاب آفرین ملکوتی کارناموں پر تحسین وتبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

مقام نبوت تو ایک طرف۔ شمع نبوی سے اکتساب ضیا کرنے والے مرد مومن کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اسکی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے پاس نہیں پھٹکتا دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیر جگر دار کے سامنے لرزہ براندام ہوتی ہیں۔ اس کی قوتِ بازو حکومت الٰہیہ کے قیام وبقا کی کفیل ہوتی ہے۔ وہ قوانین خداوندی کا عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ "مجدد" ہوتا ہے جسکی قوت ایمانی اور بصیرت فرقانی سے محمد رسول اللہ والذین معہ کے عہد سعادت عہد کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یہ وہ مسیحا ہوتا ہے جس کے اعجاز نفس سے مردہ قوم میں از سر نو زندگی پیدا ہوجاتی ہے یہی وہ "مہدی" ہوتا ہے جو خود اللہ کی صراط مستقیم پر گامزن ہو کر ساری دنیا کے لیے ہدایت وسعادت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد ایسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ:-

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط ۵:۵۴

اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے، مومنین کے سامنے جھک جانے والے (نہ کہ انہیں کافر بنانے والے) کفار کے سامنے اکڑ جانے والے (نہ کہ ان کی خیر منانے والے) اللہ کے راستے میں (میدانِ) جہاد میں نکل آنے والے (نہ کہ جہاد کو منسوخ کرنے والے) اور (اعلائے کلمۃ الحق میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔

یہ ہیں خصائص جماعت مومنین کے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اس کے برعکس یہ دیکھیے کہ آپ کو عصر جدید کی ایرانی اور ہندی "مجددیت" "مہدویت" "مسیحیت" اور "نبوت" سے

محکومی ومسکینی ونومیدئ جاوید

کے سوا اور کیا ملا۔ یہ آنے والے آئے۔ آکر چلے بھی گئے اور قوم کی یہ حالت کہ

وہی آہ نیم شبی رہی وہی نالہ سحری رہا

کچھ ملنا تو ایک طرف۔ اس خاکستر پارینہ میں کہیں کوئی چھپی ہوئی چنگاری تھی تو وہ بھی ان حضرات کے دم قدم کی برکت سے بجھ گئی۔ یہ فرق ہے ایک زندہ قوم کے ارکان اور مردوں کی بستی کے افراد میں۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحب الہام ۔۔۔ ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز

اسکے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی ۔۔۔ ہو جاتی ہے خاک چمنستاں شرر آمیز

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار ۔۔۔ کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

اس مرد خود آگاہ و خدامست کی صحبت ۔۔۔ دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے

غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز (اقبالؒ)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ نبیؐ اکرم کے بعد نبوت کا تو تصور تک بھی ذہن میں نہ لائیے۔ نبوت کی مختلف قسمیں نہیں ہیں۔ نبوت ایک ہی قسم کی ہے اور وہی اصلی اور حقیقی نبوت ہے۔ ظلّی۔ بروزی تدریجی وغیرہ نبوتوں کا تخیل یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم میں ان نبوتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ باقی رہے مجدد۔ اور مہدی۔ سو ان کے متعلق بھی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم میں کسی "آنے والے" کا ذکر نہیں ملت اسلامیہ خیر امتہ ہے۔ بہترین قوم ہے۔ اس بہترین قوم کے منتخب افراد مہدی ہیں۔ مجدد ہیں۔ امام للناس ہیں۔ قوموں کی امامت کرنے والے ہیں۔ ان کے لئے کوئی خاص وقت متعین نہیں۔ کوئی خاص وقفہ مقرر نہیں۔ اس سے پیشتر اسلاف میں جو حضرات علیہ الرحمتہ قوانین الٰہیہ کی نشر و ترویج اور حکومت خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اٹھے۔ وہ مہدی تھے۔ مجدد تھے۔ اسی طرح اس کے بعد ہونگے یہ سمجھ لینا کہ یہ خیر امتہ۔ یہ امتہ وسطیٰ۔ (بہترین قوم) اپنی حالت کو جیسا جی میں آئے رکھے۔ دنیا کی ذلیل ترین قوموں میں اس کا شمار ہو۔ بیکسی و بے بسی۔ ذل و مسکنت کے عتاب الٰہی میں گرفتار ہو۔ اس عذاب

خداوندی سے نجات حاصل کر کے اسے خود منعم علیہ بننے کی ضرورت نہیں۔ آخری وقت میں ایک آنے والا آئیگا اور ان کی ذلت و رسوائیوں کو شوکت و عظمت میں بدل دیگا۔ اور قوم کو بیٹھے بٹھائے حکومت و سلطنت مل جائیگی۔ خود فریبی اور خدا فریبی ہے کہ خدا کا تو یہ قانون واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ہمارے سامنے موجود ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

یقیناً اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر پیدا نہیں کرتا تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔

جب تک آپ کے اندر ایک ایمانی تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جب تک آپ کے قلب و نظر میں تغیر واقع نہ ہوگا آپ کی ذلت و رسوائیاں کبھی سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل نہیں سکینگی۔ یہ انقلاب آپکے اندر سے اٹھے گا۔ کہیں باہر سے نہیں آئیگا۔ اور جب آپ میں یہ قرآنی انقلاب پیدا ہو جائیگا تو پھر آپ کے اندر وہ مجددینِ ملت اور وہ مہدیانِ برحق پیدا ہونگے جو پھر سے صدر اول کے نظام خداوندی کی احیاء و ترویج کرینگے۔ جن کے نقوش قدم میں ایک دنیا فلاح و سعادت کا راستہ دیکھیگی۔

آج مسلمانوں ہی کو نہیں۔ ساری دنیا کو اس قسم کے مجدد و مہدی کی ضرورت ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نظامہائے زندگی کو خود اپنے ہاتھوں سے پاش پاش کر رہا ہے اور اس کے بعد اس کے پاس کوئی ایسا آئین حیات نہیں جو اس کی جہنم کو جنت میں بدل دے یہ آئین حیات مسلمانوں کے پاس وراثتاً چلا آرہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے اندر کوئی ایسا مجدد و مہدی پیدا ہو جائے جو دنیا کو اس آئین سے روشناس کرادے۔ آج حالت یہ ہے کہ

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس ‎ ‎ خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں ‎ ‎ نے جدتِ گفتار ہے نے جدتِ کردار

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت

ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار۔ ‎ ‎ (اقبالؒ)

یہ مہدیٔ برحق اس طرح پیدا ہوگا کہ مسلمان عجم کے افیونی تخیلات سے دامن جھٹک کر پھر سے قرآن کی طرف آجائے۔ قرآنی روشنی میں اپنے اندر مرکزیت پیدا کرے۔ وحدت افکار (ایمان) اور وحدت کردار (اعمال) سے عملاً توحید کا ثبوت دے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس کے اندر مجددین کرام و مہدیان عظام کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے یا نہیں۔ یاد رکھو۔ مہدیٔ برحق ملت کی زندہ خاک کے ذرات سے ترکیب پاکر ادپر کو اٹھیگا۔ بنا بنایا آسمان سے نہیں اُتریگا۔ ان فیھا لآیات لقوم یعقلون

نبوّت

میں نہ عارف نہ مجدّد نہ محدّث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلک نیلی فام

عصر حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہ تمام

"وہ نبوت ہے مسلماں کے لیئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام!"

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

دیکے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اسکی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(حضرت علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

حکومتِ الٰہیہ

"قریب بیس برس اُدھر کا ذکر ہے۔ پرنس سعید حلیم مرحوم نے فرانسیسی زبان میں ایک گراں قدر مقالہ تحریر فرمایا۔ مسٹر مارمیڈیوک پکتھال مرحوم نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سید ہاشمی صاحب نے اسے اردو کا لباس پہنایا اور سابق جمعیتِ دعوت و تبلیغ اسلام نے اسے ۱۹۲۰ء میں بعنوان "خدا کی بادشاہت" شائع کیا۔ مضمون اس قدر اہم تھا کہ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اطراف و اکنافِ ملک میں اس کی شہرت پھیل گئی اور ایک مدت تک اس کا چرچا زبانوں پر رہا۔ اس مضمون کے متعلق بعض حضرات کی طرف سے استفسارات موصول ہوئے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے تاکہ اس کی افادیت عام ہو جائے۔ شروع میں مسٹر پکتھال مرحوم کا دیباچہ شائع کیا جاتا ہے جس میں پرنس سعید حلیم مرحوم کی گرامی قدر ہستی کا تعارف کرایا گیا ہے اس کے بعد اصل مضمون بالاقساط شائع ہوگا۔ یہ مضمون اگرچہ بیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے اور مصنف کے پیشِ نظر احوال و ظروف بھی ٹرکی اور مصر کے تھے۔ لیکن چونکہ اس میں ان حقائق سے بحث کی گئی ہے۔ جن کی بنا قرآن کریم پر ہے۔ اس لئے اس کے مطالعہ کے بعد آپ ہم متفق ہوں گے کہ مرورِ وقت نے اس کی افادی حیثیت کسی صورت میں بھی کم نہیں کی۔ اور ہندوستان میں اس کی اشاعت کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی بیس سال قبل۔ بلکہ آج یہ ضرورت کچھ اور بھی بڑھ چکی ہے۔

یہ مضمون مسٹر پکتھال مرحوم کے الفاظ میں "ہم سب کے پورے غور و توجہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ یہ احیائے ملت کا وہ راستہ بتاتا ہے کہ اسلامی دنیا اسے اختیار کر لے تو کامیابی یقینی ہے۔ انشاءاللہ"

(طلوعِ اسلام)

دیباچہ

(از مسٹر محمد پکتھال مرحوم)

آئندہ اوراق ایک مصری شہزادے کے قلم سے نکلے ہیں۔ جو فاضلی خاندان کا فرد تھا اور یہ خاندان دودمانِ خدیوی سے قرابت قریبہ رکھتا ہے۔ روشن خیال باپ کی عمر زیادہ تر جلاوطنی میں گزری اور آج بھی اُسے ترکوں کے خیالات میں جو انقلاب ہوا اُس کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ سعید حلیم نے بھی جدید مغربی تعلیم پائی۔ وہ جس بے تکلفی سے عربی اور ترکی زبان بولتے اسی طرح فرانسیسی میں گفتگو کرتے تھے اور قریب قریب اتنی ہی قدرت انھیں انگریزی زبان پر حاصل تھی۔ بایں ہمہ اپنے بعض معاصرین کے خلاف جنھیں اسی قسم کی تعلیم ملی۔ سعید حلیم نے اسلامی اور مشرقی طرز خیالات کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ نہایت خاموش، بے ریا، اور نہایت ہی خلیق اور متواضع شخص تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھیں ترکہ میں اتنی دولت ملی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو عیش وعشرت میں زندگی گزارتے لیکن اُنھوں نے اپنے باپ کی فیض رساں طبیعت بھی ورثہ میں پائی تھی، جس کی بدولت انھیں ترکی اور مصر دونوں ملکوں میں احیائے قومی کی تحریک سے خالی ہمدردی نہ تھی بلکہ کچھ زیادہ انہماک تھا۔ وہ ترکی انقلاب ۱۹۰۸ء کے اصول کے بڑے حامی تھے اور ان کا اس کی حمایت میں صادق اور ثابت قدم ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ جب ستمبر ۱۹۱۲ء میں نوجوان ترکوں کے ہاتھ سے اقتدار نکل گیا اور سعید حلیم پاشا کے طبقہ کا قریب قریب ہر شخص نوجوان ترکوں سے آنکھیں چرانے لگا۔ تو اس وقت میں بھی اُنھوں نے اپنی مجلس اتحاد و ترقی کے معتمد اعلیٰ بنائے جانے سے انکار نہیں کیا۔

جنوری ۱۹۱۳ء کے مختصر انقلاب کے بعد وہ وزیر صیغۂ خارجہ اور پھر محمود شوکت پاشا کے شہید کیے جانے کے بعد وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حکومت کے ہر رُکن کے مارے جانے کا خوف تھا۔ اسی زمانہ میں راقم الحروف کو سعید حلیم پاشا سے ربط وضبط کا موقع ملا۔ اور میں

تصدیق کر سکتا ہوں کہ ان کو اس قتل کے امکان سے ذرا بھی ہراس نہ تھا۔ وہ اپنے ساتھی وزیروں کی مثل نہایت بہادر آدمی تھے۔ بایں ہمہ ان کے سادہ طور طریق اور شیریں گفتار میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جس سے کوئی یہ قیاس کرے کہ اس وجیہ پیشانی کے اندر قومی تحریک کا بہترین دماغ موجود اور مصروف عمل ہے۔ دوست دشمن عام طور پر انھیں اسم فرضی جانتے اور یہ سمجھتے تھے کہ مالدار اور خاندان شاہی سے ہونے کی بنا پر انھیں ایک ایسی حکومت کا صدر بنا دیا گیا ہے جس میں نام نہاد انقلاب پسند بھرے ہوئے تھے۔ تاکہ ملک میں دولت مندوں اور جاگیرداروں کے طبقے مطمئن ہو جائیں۔

جس قسم کے انقلاب کا تصور سعید حلیم پاشا کے ذہن میں تھا۔ اس کا اندازہ آئندہ اوراق سے ہوگا۔ یہ اس تصور سے ذرا بھی اختلاف نہیں رکھتا جو محمود شوکت پاشا۔ احمد نیازی بے۔ اور خیری آفندی جیسے بہت سے زندہ اور مرحوم ترکوں کے دل میں بسا ہوا تھا۔ خیری آفندی وہ صاحب ہیں جو نوجوان ترکوں کے زمانہ میں شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے خیالات کو اس خوبی سے بیان نہ کر سکتا تھا جیسا کہ سعید حلیم پاشا نے کیا ہے۔ واقع میں مجھے رہ رہ کے پچھتاوا آتا ہے کہ جس زمانہ میں میں روزمرہ سعید حلیم پاشا سے ملتا تھا اس وقت مجھے کبھی گمان نہ گزرا کہ وہ ایسی وسیع معلومات کے آدمی ہیں، اور مذہب اسلام اور اس کے جملہ متعلقات سے ایسی پر جذبہ اور عاقلانہ محبت رکھتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں انھوں نے وزارت خارجہ کا کام خلیل بے کے سپرد کیا اور فروری ۱۹۱۷ء میں خرابیٔ صحت کی وجہ سے وزارت عظمیٰ کا عہدہ طلعت پاشا کے حوالے کر دیا جو روایات عامہ کے بموجب ہمیشہ سے سعید حلیم کے پس پردہ کام کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں سعید حلیم کا مزاج زمانہ جنگ میں وزیر اعظم رہنے کے مناسب نہ تھا۔ اور ان کے اوصاف حسنہ ہی ہر قدم پر ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

انگریزوں کا استنبول پر (چند روزہ) قبضہ ہوا تو انھوں نے شہزادہ سعید حلیم کو گرفتار کر لیا اور مالٹا میں جلاوطن کر دیا۔ جہاں سے رہائی پانے کے بعد وہ روما چلے آئے۔ اسی شہر میں جاڑے کے زمانہ میں ایک دن پانچ بجے شام کو وہ اپنے مکان واقع دیاکوس تاکی کے دروازہ کے سامنے گاڑی سے اتر رہے تھے ان کے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آیا جو محمود شوکت، طلعت اور بہت سے بہترین افراد کو تقدیر سے

دکھایا تھا۔ یعنی ایک نوجوان ارمن نے بالکل بھڑ کر اور وسط پیشانی کا نشانہ لے کر طپنچے کا فیر کیا۔ وہ مہلک زخم کھا کر گرے اور جب انھیں اٹھا کر مکان میں لائے تو اُسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ اس طرح اُس شخص کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوا جو بہت ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں اپنے عہد کا سب سے بڑا عالی دماغ مسلمان مانا جائے۔

یہ فروری ۱۹۱۷ء میں عہدے سے دست کش ہونے کا ذکر ہے۔ کہ اُنھوں نے ترکی زبان میں وہی شہرۂ آفاق کتاب "اسلام اشمق" (اسلامی بنانا) تصنیف کی جس کے لکھنے کا انھیں ایک مدت سے خیال تھا۔ شائع ہونے کے بعد اسے حیرت انگیز قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا عربی زبان میں اور میں سمجھتا ہوں کہ روسی اور فارسی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ اور اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک عجیب قسم کی آگ سی لگا دی۔ ہمارا یہ رسالہ ان کے ایک دوسرے مضمون کا ترجمہ ہے جو شہادت سے کچھ ہی قبل اُنھوں نے فرانسیسی جریدہ "اوریان اے اُکسی دان" کے لئے لکھا تھا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا "اسلام اشمق" میں جن خاص خاص خیالات کو ظاہر کیا گیا ہے ان میں سے صرف ایک خیال اس فرانسیسی مضمون میں لے لیا ہے اور دوسرے ضمناً جستہ جستہ آگئے ہیں جس خیال کو چنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے موجودہ انحطاط کا سبب یہ ہے کہ اسلامی اصول کی عملی تعبیر غلط یا ناقص طور پر کی گئی ہے پس اس انحطاط کا چارۂ کار بھی یہ ہوگا کہ انھیں اصول سے زیادہ صحت اور دانائی سے کام لیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنے انحطاط کا مداوا اس طرز حکومت اور اس طرز تمدن کی نقالی کو قرار دیں جس تمدن نے ان اسلامی اُصول ہی کو سرے سے باطل اور ناقابل عمل ٹھہرایا ہے۔ علوم طبیعیات سے کہ اپنی ناموری کے زمانہ میں مسلمان ان کے شمع بردار تھے، غفلت برتنے کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہماری مادّی یا دنیاوی خوشحالی میں زوال آگیا۔ سعید حلیم پاشا ان علوم طبیعی کو شریعت کا ایک ضمیمہ سمجھتے ہیں۔ اور راقم الحروف تو یہاں تک تیار ہے کہ قرآن شریف اور احادیث نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات) کے مختلف احکام اور ارشادات کو پیش نظر رکھ کر جن میں فکر و تدبر اور تجربہ اور مشاہدے سے علم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ علوم طبیعی کو شریعت کے نصف جزو سے موسوم کرے اگرچہ مسلمان

ایسے پھکے ہیں کہ اُنھوں نے اس نصف جزو کو کلیتاً پس پشت ڈال دیا۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ افلاس اور روز افزوں جہالت ہوا۔

کچھ شک نہیں کہ ان علوم طبعی کو ہمیں یورپ سے سیکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اس میدان میں یورپ ہم سے کہیں کا کہیں آگے نکل چکا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اور ہر شے جو انسانی ترقی کے لئے ضروری ہے وہ دین اسلام کے معمور خزانہ سے خود ہم یورپ کو دے سکتے ہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ہم اس خزانہ کو ڈھونڈھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو ہر زمانہ کی ضروریات مہیا کر سکتا ہے اور صرف اسی سکہ پر قناعت نہ کریں جو کسی خاص زمانہ کی ضروریات کے لئے ضرب ہوا یا اسلامی دنیا میں چلتا رہا ہے۔

انتظام مملکت، تعلیم، سیاسی طرز عمل اور روزانہ معاشرت کے معاملات میں ایک حقیقی اسلامی ملک میں "دینی" اور "دنیادی" کا کوئی امتیاز اور تفریق وجود نہیں رکھتی۔ جہاں خدا کی بادشاہی ہے وہاں ہر "دنیاوی" شے "دینی" ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اسلامی ملک میں جداگانہ مذہبی آئین و قوانین محض بے محل ہیں اور ان کی مطلق ضرورت نہیں پیش آسکتی۔ ایسے آئین و قوانین کی گنجائش صرف اس وقت نکلتی ہے۔ جبکہ خود ملک اسلامی نہ رہے "اسلام الشمق" یعنی ملک و حکومت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنانا ہے تو ہمیں لامحالہ جداگانہ مذہبی تنظیم کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اور اس مصنوعی "پیر پرستی" سے گلوخلاصی کرنی پڑے گی جس کو سعید حلیم پاشا اسلامی دنیا کا سب سے بڑا گمراہ کن اور اس لئے انحطاط کا سبب بتاتے ہیں۔ اور خود ملک و حکومت کو ایک مذہبی تنظیم بنانا لازم ہو گا۔ جن کے عہدہ دار ہی دین کے رہنما اور محافظ ہوں۔ یورپی مصطلحات کا اسلامی ضروریات کے لئے ناکافی ہونا اور ہمارے خیالات ذہنی سے اُن کو جو بُعد ہے وہ اس بات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل یورپ ہماری مذکورہ بالا تدابیر کو (Secularisation) یعنی ملک و حکومت کو "دنیاوی" رنگ میں رنگنے سے تعبیر کریں گے جس سے اُن کی مراد کوئی ایسی شے ہوتی ہے جو دین کی ضد ہو حالانکہ ہم ان تدابیر کو سب سے اہم مذہبی اصلاحات کا خطاب دیں گے جو بالکل صحیح اور اسلامی تعلیم کے عین مطابق ہو گا۔ ایسے اسلامی ملک میں کوئی شے جسے یورپ والے "مذہبی" یعنی شرعی فرقے کے نام سے موسوم کر سکیں۔ ہو گی تو وہ ان

اشخاص کا گروہ ہوگا جنھوں نے اسلامی علوم سے خاص طور واقفیت و مہارت بہم پہنچائی ہے۔ اور جن کی تعظیم وتکریم اسی حد تک اور محض اس بنا پر کی جائے گی کہ وہ اپنے علم وفضل سے عمل کا کام لیتے ہیں ۔ اسی گروہ میں سے قوم مجلس وضع قوانین کے ارکان کا انتخاب کرے گی۔ یہ لفظ سعید حلیم پاشا کا ہے اور ہم چاہیں تو اُسے علماء کی بزم شوریٰ یا دارالندوہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی مجلس اسلام کے دور عظمت و اقبال میں اسی نام سے موسوم ہوتی تھی

جب ملک "اسلامی" بنالیا جائے اور اس کی تنظیم مصنف کے کھینچے ہوئے خاکے مطابق عمل میں آجائے اور اسلامی اخلاق اور سیاسیات کے ماہرین حکومت کے مشیر ہوں۔ کہ یہی گروہ وضع قوانین کا جائز طور پر حق رکھتا ہے۔ تو اس وقت حکومت اپنے آپ اُن راستوں پر چلے گی جو اسلام کے بنیادی اُصول کے موافق ہیں جیسے کہ:۔

(۱) قانون کی نظر میں تمام نفوس کا مساوی ہونا۔

(۲) ذکور و اناث کے ہر فرد کی تعلیم (اسلامی ملکوں میں اس قسم کی عالمگیر اور بلامعاوضہ تعلیم کا اس زمانہ سے رواج تھا جس کے صدیوں بعد تک یورپ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی ۔

(۳) سود خواری کا امتناع (سود یورپ کی جدید تہذیب کی بنیاد ہے اور اشتراکیت اور متروکیت (Communism) اور اہل حرفہ کی فرقہ بندیوں کی شورش کا اصلی سبب یہی ہے اور یہ وہ تحریکیں ہیں جن سے اب مغربی تہذیب کا وجود ہی معرض خطر میں نظر آرہا ہے۔ اسلامی قانون امتناع سود کا منشا یہ ہے کہ ایک مسلمان کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے بنی نوع کی احتیاج رفع کرنے کا کوئی نفع کمائے یا کمانے کے در پے ہو۔ اسی نظر سے اسلامی ملک میں سخت قوانین بنائے جائیں گے۔ کہ سود خواری اور نیز یاِحتاج زندگی کی فراہمی میں ناجائز نفع کمانے والوں کا سد باب کیا جائے ۔

(۴) مسکرات اور قمار بازی کا امتناع ۔

(۵) زکوٰۃ کی باضابطہ وصولی اور بیت المال کا انتظام ۔ تاکہ ملک میں دولت کی تقسیم منصفانہ اُصول پر کی جا سکے ۔

(۶) صدقات وخیرات۔

(۷) ہر قسم کے عہد و پیمان کا احترام

(۸) فرقۂ نسوان کے جان و مال اور حقوق کا لحاظ۔

(۹) صغیر سن بچوں خاص کر یتامیٰ کی جان و مال، املاک وحقوق کا احترام۔

(۱۰) نوکر چاکر اور تمام غریب کام کرنے والوں کے حقوق کا احترام۔

(۱۱) قانونِ مناکحت پر عمل، اس طرح کہ نکاح 'فریقین کے درمیان ایک معاشرتی عہد و پیمان بن جائے۔ اور طلاق اور فسخ نکاح 'اور نکاح ثانی کے واسطے ایسی آسانیاں رکھی جائیں کہ اس آئین میں غلامی اور عمر قید کی شان باقی نہ رہے نہ زن وشو کے معاملات کی تشہیر و فضیحت ہو۔ اسی کے ساتھ عصمت فروشی اور بداطواری کی بلائے طاعون سے قوم محفوظ رہے۔ پھر تہذیب ومتانت کو مدنظر رکھ کے ذکور واناث دونوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے جو دونوں کی فلاح وبہبود نظام معاشرت اور حقوق اولاد کے معارض نہ ہو۔

(۱۲) اسلامی قانون وراثت پر عمل۔ جو افراد کو بے حساب دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرنے سے مانع ہے اور اولاد میں سے کسی کو محروم الارث نہیں ہونے دیتا۔

(۱۳) عام فوجی تربیت۔

(۱۴) اسلامی قواعد کے ماتحت غیر اقوام سے تعلقات، معاہدوں کا احترام، ہوس ملک ستانی اور ایسی قوم پرستی کا سدِ باب جو حق و انصاف کو نظر انداز کر دیتی ہو۔

(۱۵) زمانہ جنگ کے متعلق اسلامی ضوابط۔

یہ چند مباحث ہیں 'جن پر "اسلام اشمق" میں بحث کی گئی ہے اور ان کے بیان کرنے سے اُمید ہے کہ ناظرین کو مضمون ہذا کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مجموعی طور پر شہزادہ سعید حلیم پاشا کا یہ مقالہ "جدید" اور عقلی بنیادوں پر شریعت حقہ کی ایسی حیرت انگیز تصدیق وثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ شاید ہی کسی مسلمان کے ذہن میں آئے ہونگے۔ یہ ہم سب کے پورے غور و توجہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ احیائے ملت کا وہ راستہ بتاتا ہے کہ اسلامی دنیا اسے اختیار کرے۔ تو کامیابی بالکل یقینی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ +

اِصلاحِ اُمّت

بقلم شہزادہ سعید حلیم پاشا (شہید)

یہ دیکھ کر خود میری زندگی میں اسلامی قومیں اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو رہی ہیں اور اغیار کے طوق محکومی کو اُتار پھینکنے کی متمنی ہیں۔ میرے دل میں کمال انبساط پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس بیداری اور احساس کے معنی یہ ہیں کہ بالآخر اُنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے فریضہ کو، جو ہر مُسلم کا شریف ترین فرض ہے۔ سمجھ لیا اور جان لیا کہ بغیر آزادی کے کوئی مسرت اور حقیقی ترقی حاصل نہیں ہوسکتی۔ بایں ہمہ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ میرا انبساط خالص و بےغش نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقوں کے اکثر اکابر کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے ملکوں میں وہی رائج کرنے پر تلے ہوئے ہیں جن کا اہل یورپ کی نقالی ہونا مشکل سے چھپ سکتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا کے اُصول اور تخیلات کو اختیار کئے بغیر ہمارے احیار کی اور کوئی سبیل نہیں ہوسکتی۔ مسلم "ارباب فکر" کی یہ ذہنی کیفیت مجھے نہایت ہی شاق گزرتی ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اب اس بات کا ادراک نہیں کرسکتے کہ دین اسلام نے جہاں خدائے واحد سبحانہ کی پرستش کا ہمیں سبق دیا ہے وہاں اخلاق و معاشرت کے اصول کا مکمل دستورالعمل بھی ہمیں عطا فرمایا ہے۔ جس کا ماخذ و مصدر وہی عقیدۂ توحید باری تعالیٰ جل سلطانہ ہے۔ اسی عقیدہ نے ہمیں مذکورہ بالا اُصول کا مکلف بنایا۔ مسلمانوں کا ہر طرز تمدن انہی اصول کا ساختہ پرداختہ ہے اور انھیں اُصول نے مسلمانوں کی ہر جماعت و قوم کی پرورش کی ہے۔ پس گمان ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ "اعیان"

کو اب اس بات پر کامل وثوق و اطمینان باقی نہیں رہا کہ نوع انسان کا سب سے اچھا مذہب اسلام ہے۔ وہ مذہب کی سب سے اعلیٰ اور سب سے مکمل صورت ہے اور بنفسہٖ جامع ترین معنی میں ایک تہذیب یا کامل تمدن ہے اور اسی لئے جس طرح اسلام سے ہٹ کر ابدی نجات ناممکن ہے اسی طرح تمدنی نجات بھی نہیں ہوسکتی۔ بظاہر یہ حضرات اس بات کو بھول گئے ہیں کہ جس طرح مسیحی دنیا کے تمام راستے "رومہ" کو جاتے ہیں، اسلامی دنیا کے تمام شوارع کی منزل مقصود "مکہ معظمہ" ہے۔ ان دونوں ملتوں کا راستہ اور قبلہ آمال جُدا ہے۔ اور نوع انسان کی عام ارتقا ریں انھیں ایک دوسرے سے مختلف کام انجام دینا ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مسیحی دنیا اور اسلامی دنیا کے افکار و خیالات، مرغوبات و مقاصد، ضروریات و تدابیر میں بھی اتنا ہی بڑا فرق ہے جتنا کہ ان دونوں کے عقاید اخلاقی اور تمدنی نظریات طرزِ فکر اور نیز ایک طرف دنیائے مسیحی کے وجود میں آنے اور دوسری جانب اسلام کے ظہور و فروغ پانے کی خاص صورت میں پایا جاتا ہے۔ واقع میں یہ فرق ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ موجودہ مقاصد و تدابیر ہر ملت کی ابتدائی نشو و نما اور مذہبی عقاید ہی پر مبنی ہیں۔

نظر براں یہ سمجھنا فاش غلطی ہے کہ مسیحی دنیا نے اپنی سیاسی اور تمدنی ضروریات کے مطابق جو آئین و نظام مرتب کئے ہیں وہ ہمارے مناسب حال بھی ہوسکتے ہیں۔ خواہ ان میں ہم کتنی ہی ترمیم بھی کرلیں حقیقت میں ان ہر دو ملتوں کا فرق اتنا گہرا اور اُصولی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق انہیں ہم خیال بنانے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔

وہ تعلیم یافتہ مُسلمان جو مغربی تمدن میں شیر و شکر ہو جانے کو ملت اسلامی کے احیار کا باعث سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کے قصور فہم کا سبب سوائے اس کے اور کیا قرار دیا جائے کہ یہ اجانب کے اُس تسلط و تغلب کے ناشدنی اثرات ہیں جو شریعت مصطفوی صلعم کے پیرو برداشت کرتے رہے اور جس نے ان کے خیالات میں انتشار و پراگندگی پیدا کردی۔ یہ نئی ذہنیت جن آرائے فاسدہ سے ملوث ہے، میں انھیں دور کرنا چاہتا ہوں اور میرا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ عمدہ اخلاق اور اصول معاشرت کے اعتبار سے اسلامی دنیا کو یورپ سے رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کے برعکس حقیقت میں خود مسیحی ممالک

محتاج ہیں کہ اس معاملہ میں اسلام سے سبق لیتے آئیں۔ اس مہتم بالشان نکتے کو لوگوں کے دلنشین کرنے کی بہترین صورت یہ نظر آتی ہے کہ اسلام نے انسانی معاشرت کی اصلاح و بہتری میں جو کام کیا ہے اُسے صاف و سادہ پیرایہ میں پیش کر دیا جائے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ یہ یاد دہانی میرے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کو قطعی طور پر یقین دلا دے گی کہ دنیائے اسلام کی اصلاح کی کوئی شکل اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاک و برگزیدہ مذہب کو زیادہ اچھی طرح سیکھیں سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

اسلام کے اصولِ معاشرت ۔ دینِ اسلام نے معاشرت کے متعلق جو کچھ کیا ہے وہ اس بنیادی عقیدے پر مبنی ہے کہ شریعت کے احکام اٹل ہیں۔ اسلامی تمدن وہ ہے جو ان احکام کے ماتحت ہو۔

شریعت، ان فطری، اخلاقی اور معاشرتی حقائق کا لب لباب ہے جو نبی کریم (علیہ التحیۃ والتسلیم) پر بذریعہ وحی الٰہی منکشف ہوئے اور ان پر انسانی فلاح کا انحصار ہے۔ اسی طرح شریعت کی فرمانروائی کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ان اخلاقی اور تمدنی قوانین کی ماتحتی قبول کریں جن کا ماخذ خود فطرت ہے۔ اور اس لئے وہ ایسے ہی ناقابل تغیر اور آدمی کی رائے سے مافوق و آزاد ہیں، جیسے قوانین طبعی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ان قوانین کی نظر میں تمام انسان مساوی ہوں گے اور ان کی آزادی صرف اسی حد تک محدود و مقید ہو گی جس حد تک حکم و ارادۂ الٰہی کے ماتحت رہنے میں ضروری ہے۔ کیونکہ یہ قوانین اسی ارادۂ الٰہی کا ظہور ہیں۔ شریعت، یا یوں کہو کہ شریعت کی فرمانروائی کا قانون بنا کے اسلام نے انسان کی سچی مساوات و آزادی کی بنیاد قائم کر دی اور ضمناً بنی نوع انسان کی حقیقی اُخوت کا سبق دیا اور اس طرح تمدن کا سب سے افضل و صحیح تخیل پیدا کر دیا۔

شریعت کی فرماں روائی کا اُصول ماننے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اس بنیادی حقیقت کو سمجھتا ہے کہ ہر وجود، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی ہو، بقا کے لئے اپنی فطرت کے مناسب خاص خاص قوانین طبیعی کے ماتحت ہے اور اسی قاعدے سے نوعِ انسان کا تمدنی وجود بھی تمدن کے خاص خاص طبعی قوانین پر منحصر ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح اس کا جسمانی وجود جسم کے طبعی قوانین کے ماتحت ہے۔ اس طور پر مذہب اسلام یہ اصول قائم کرنے میں کامیاب ہوا کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر چلنے

پر مجبور نہیں ہے گو یہ قانون بڑی سے بڑی تعداد کے گروہ کی رائے سے بنایا گیا ہو کیونکہ ایسے قانون میں لازمی طور پر کچھ نہ کچھ خود رائی کا دخل ہو گا۔ بلکہ یہ کہ انسان پر صرف اپنے خالق سبحانہ کے حکم وارادہ کی اطاعت فرض ہے جو قوانین طبیعی کی شکل میں ظہور ہوا۔

اس طرح اسلام نے تجربیات وعقلیات دونوں کو زیر کر لیا۔ کہ یہ دونوں ہزارہا تعصبات اور ضلالتوں کا سرچشمہ تھے۔ اور ظہور اسلام سے قبل لوگوں کی تمدنی تنظیم کے طریقے انہی دو کی رہنمائی سے بنائے جاتے اور نشو ونما پاتے تھے۔ اسلام نے وہ اُصول تعلیم کئے کہ انسان ان فرضی حکومتوں کے قیدخانہ سے باہر نکل آیا جنہیں اس نے اپنے آپ پر اس لئے مسلط کیا تھا کہ یہ فطری ضرورت کسی طرح پوری ہو کہ کوئی قوت یا حکومت ملکی اور تمدنی اعتبار سے انسانوں کو حفظ امن اور قرینے کے ساتھ رکھ سکے۔ لیکن اس میں کسی کو حجت کرنے کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ اسلام ہی تھا جس نے حکومت کا صحیح تصور پیدا کیا اور اس کی اصلی قدر وقیمت لوگوں کو سکھائی۔ کیونکہ اسی نے یہ نکتہ انسان کے ذہن نشین کیا کہ حقیقی اور غیر متنازعہ فیہا حکومت کا سرچشمہ صرف خدائے واحد سبحانہ ہے اور اس حکومت کی عملی صورت وہ شریعت آسمانی ہے جس نے انسان کے باہمی حقوق وفرائض کا صحیح معیار قائم کیا۔ اسی شریعت سے لوگوں کو کامل اطمینان ہوا کہ اب اخلاقی یا تمدنی تنازعات میں عدل وانصاف ہو گا۔ اسلام نے اس توہم کا خاتمہ کر دیا کہ انسان کی ضعیف عقل، احکام وقوانین کا ماخذ ہے۔ عقل نے حقوق وفرائض کے جو قوانین وضع کئے تھے ان سے فقط ایک ظالم وغاصب حکومت وجود میں آئی جو کہ جور وتعدی پر مبنی تھی۔ یہ وہ مصنوعی وجابرانہ فرماں روائی تھی جس کا کام صرف نفسانی اغراض کو پورا کرنا تھا۔ گو ان اغراض کی نوعیت ان افراد کے بدلتے رہنے کے ساتھ بدلتی رہتی تھی جو وقتاً فوقتاً حکومت پر قبضہ جما لیتے تھے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت حقیقت میں ربانی تو ہے لیکن مافوق الفطرت نوعیت نہیں رکھتی جیسا کہ لوگ اکثر اسے ایک خرق عادت شے کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں۔ اسکے مافوق الفطرت نہ ہونے ہی کا سبب ہے کہ اسلامی نظام میں پیشوایان مذہبی کا کوئی مخصوص گروہ نہیں ہے دراصل شریعت خدائی دستور العمل ہے جو سراسر طبیعی قوانین پر مشتمل ہے۔ اگر شریعت کا کامل اتباع واحترام فرض ہے تو وہ اسی لئے

کہ اس میں تمدن انسانی کی وہ حقیقتیں مدنظر ہیں جنہیں خدائے علیم سبحانہ نے ہمیں سکھایا ہے اور جس کی قدر سب سے بڑھ کر اس بنا پر ہمیں ہونی چاہئے کہ صرف اسی سے ہمیں تمدنی مسرت و رفاہ میسر ہو سکتی ہے اور نیز اس لئے کہ اسی شریعت کی تعلیم دینے کے واسطے ایک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کرنے کی ضرورت ہوئی جسے وحی الٰہی سے مشرف کیا گیا کہ اپنے بنی نوع کو پروردگار عالم سبحانہ کے مبارک منشا سے مطلع کرے۔

اسلام نے چشم انسانی کے سامنے یک بہ یک ایسی راہیں کشادہ کردیں جو عقلیت کے راستوں سے کہیں زیادہ وسیع و مستقیم تھیں عقلیت نے جھوٹے دعاوی اور فاسد اُصول پرستی سے انسانی دماغ کو معطل اور فطری نشوونما کو مسدود کر رکھا تھا۔ اسلام نے انسان کے عالم افکار میں بنیادی انقلاب پیدا کر دیا۔ جو ایسا ہی مکمل اور قطعی تھا جیسا کہ وہ انقلاب کہ اسلام جہاں کہیں گیا عملی زندگی میں اس نے برپا کیا۔ طبائع انسانی میں اسی اسلام کے پیدا کردہ تغیر کی برکت تھی کہ آدمی کو اپنی دماغی قوتوں کی پرداخت اور ترقی دینے کا موقع میسر آیا اور وہ اپنے مشاہدے اور تدبر کی خداداد قابلیت سے پوری آزادی کے ساتھ کام لے سکا۔ یہی وہ تغیر ہے جس نے آدمی کو تجربی طریقے ایجاد کرنے کی راہ دکھائی اور اس طرح "علوم جدیدہ" کی بنیاد ڈالی۔ تجربی علوم کے سب سے پہلے عالم، صحیح معنی میں مسلمان مختبرین تھے۔ وہ علم کے اصلی بانی اور شمع بردار تھے۔ اور ان کے کام نوع انسان کے ابدی فضل و شرف میں محسوب ہوں گے۔

یہ مغالطہ آمیز خیال کہ شریعت، مافوق الفطرت قوانین کا مجموعہ ہے اور جو لوگ بے چون وچرا اس کا اتباع کرتے ہیں وہ محض مذہبی سودائی ہیں۔ اصل میں اس لئے پیدا ہوا کہ شریعت کا مجموعۂ قوانین جن حقائق پر مشتمل ہے۔ ان حقائق کا علم ایسے طریقوں سے نہیں ہوا جیسے کہ دوسرے طبیعی علوم حاصل کرنے میں اختیار کئے جاتے ہیں بلکہ یہ حقائق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ منکشف ہوئے ہیں۔ انسان کے قوٰی اور تجربات نے صرف بعد میں ان کی تصدیق کی اور اُن کو سچا پایا۔ بایں ہمہ میں پھر کہتا ہوں کہ ان کی اصل سے قطع نظر۔ شریعت کے قوانین میں جو کچھ ہے وہ عین طبیعی اور فطری ہے۔

لیکن یہاں اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ شریعت بذریعہ وحی کیوں منکشف ہوئی؟ دوسرے قوانین طبیعی کے دریافت کرنے کے لئے انسان کے مشاہدے اور تعقل کی جو قوتیں کافی ہیں، وہ تمدن اور اخلاق

کے قوانین دریافت کرنے میں کیوں قاصر رہیں، جواب اس کا بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا دو قسم کے قوانین۔ ایک دوسرے سے اصولی تبائن واختلاف رکھتے ہیں۔ یعنی پہلے قوانین طبیعی، جہاں تک ان کا انسان سے واسطہ ہے اس لئے قابل مطالعہ ہیں کہ ان کا آدمی کی جسمانی زندگی سے تعلق ہے۔ لہٰذا ان کی نوعیت خالص خارجی (Objective) ہے۔ برخلاف ان کے دوسری قسم کے قوانین انسان سے اس کے ذی عقل وذی شعور اور متمدن ہستی ہونے کی حیثیت سے بحث کرتے ہیں۔ پس ان کی نوعیت نفسیاتی یا جذباتی قوانین کی سی ہے۔ یعنی وہ بداہتہً موضوعی یا ذہنی (Subjective) ہیں اور انھیں خود آدمی کا معین کرنا لایعنی اور محال ہے۔ بے شبہ آدمی کو وہ دماغی آزادی اور صحیح تمیز دی گئی ہے کہ جو واقعات وحوادث اُس کے نفس سے باہر خود بخود ظہور میں آرہے ہیں۔ گو ان پر اس کی ذاتی قوتوں کا قابو نہیں، تاہم وہ ان سے صحیح نتائج کا اخراج کرتا ہے اور ان کے ایسے قوانین وقواعد مرتب کرسکتا ہے جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہوں، لیکن ان بیرونی حوادث سے گزر کر جب خود آدمی کی عقلی اور تمدنی ہستی کا سوال پیش آتا ہے۔ یعنی جس وقت ہم ایسی مخلوق پر غور کرتے ہیں جو صاحب ارادہ، اپنے لئے خود کام کرنے والی، اپنے افعال نیک وبد کے خود قاعدے وضع کرنیوالی ہے، تو اس وقت ہمارا مشاہدہ اور تعقل، خواہ کیسی ہی احتیاط اور سمجھ سے ان کا استعمال کیا جائے، مشکوک اور عام طور پر گمراہ کن رہ نما ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ جو شخص ان سے کام لے رہا ہے۔ اس کے ذاتی نقائص واسقام لازمی طور پر اس کے مستخرجہ نتائج میں نقص وفتور پیدا کردیتے ہیں۔ اس دائرے کے اندر صحیح نتیجے تک پہنچنے میں آدمی کی فطری ناقابلیت اور معذوری کی ایک تعجب انگیز مثال یہ ہے کہ اہل یورپ اتنے کچھ متمدن اور مہذب ہو جانے کے باوجود ان قوانین اخلاق ومعاشرت سے سخت جہل وبے خبری میں پڑے ہیں جو اصول فطرت کے مطابق ہیں اور اس حال میں کہ ان کی محنت نے انھیں دوسرے قوانین طبیعی کا ایک اعلیٰ درجہ کا علم عطا کیا ہے وہ اپنے مذکورہ بالا جہل کے باعث سخت تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں۔ غرض واقعہ یہ ہے کہ انسان اخلاق ومعاشرت کے فطری قوانین کو جن پر انسانی خوشیوں کا انحصار ہے۔ کبھی نہ جان سکتا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بذریعہ وحی تعلیم نہ فرماتے۔

علوم تجربی کی ضرورت کو بار بار جتانے اور ان کے سیکھنے کو ہر مسلم کا فرض قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس کے

لئے چین جانا پڑے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسی تاکید فرمائی ہے وہ اسلام کی نہایت ممتاز اور یادگار خصوصیات میں داخل ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علوم تجربی کو انسانی سود و بہبود کا ایک لازمی عنصر قرار دیتے ہیں ۔ بہرحال اسلام کی تمدنی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ آدمی کا فطری تمدن یعنی وہ جو اخلاق و معاشرت کے فطری قوانین کے مطابق ہو، صرف وہ تمدن ہے جس کی عمارت شریعت کی کامل فرماں روائی کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہو ۔ اس تعلیم کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ خود حکومت جس پر تمدن کا امن و پائیداری مبنی ہے ۔ ایسے ماخذ اور سرچشمے سے نکلی ہے کہ اس کے ماننے میں کسی کو انکار و اختلاف نہ ہوا، نہ ہو سکتا ہے ۔ یہ ماخذ خود کلام الٰہی ہے ۔ اس پر حصر کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ خود انسانی تحقیق اور تجربہ ایسا ماخذ مہیا کرنے سے عاجز ہیں ۔

علاوہ ازیں اسلام سکھاتا ہے کہ بہترین تمدن وہ ہے جس میں نفوس انسانی نہ صرف اخلاق و معاشرت بلکہ طبعیات کے قوانین کو بھی بہترین طریق پر جانتے اور ان سے کام لیتے ہوں ۔ دوسرے لفظوں میں سب سے اچھے اور خوشحال بندے وہ ہیں جو خالق سبحانہ کی مبارک مرضی کی جمیع شرائط بجا لائیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام اس حقیقت پر بہت زور دیتا ہے کہ صرف اچھے اخلاق و اعمال سے جو خوش حالی یقینی طور پر میسر آتی ہے وہ کیسی ہی دیرپا اور حقیقی کیوں نہ ہو ۔ ناکمل ضرور ہے ۔ کیونکہ مادی پہلو محروم توجہ رہا ۔ اسی طرح وہ خوشحالی جو محض قوانین طبیعی کے علم سے حاصل ہوتی ہے ۔ گو اس میں مادی راحت و مسرت کے اسباب ہاتھ آجائیں ۔ تاہم باہمی معاشرت میں امن و اطمینان میسر نہیں آتا ۔ حالانکہ یہی شے انسان کے قلبی لطف و راحت کی اصلی بنیاد ہے ۔

قوم کی فرماں روائی :۔ انسانی تمدن کے متعلق اسلامی اصول کی ایسی کھلی ہوئی فضیلت و برتری کے باوجود مسلمانوں کا طرز فکر ہمارے زمانہ میں کچھ ایسا فاسد ہو گیا ہے کہ وہ شریعت کی فرماں روائی پر قوم یا جمہور کی غیر ذمہ دار و مطلق العنان رائے کے اصول کو ترجیح دینے لگے ہیں ۔ حالانکہ اس اصول کی پیدائش کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ۔ اور اس عرصہ میں بھی جہاں کہیں اس کا تجربہ کیا گیا وہ خطا سے منزہ ثابت نہیں ہوا ۔ بات یہ ہے کہ مغربی تمدن کی مادی خوشحالی اور دنیاوی قوت سے بہت سے مسلمان "ارباب فکر" کی

آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ اور جوش مسرت میں اس تمام ترقی کو قومی فرماں روائی کے اصول کی کرامت سمجھتے ہیں۔ بعض اسلامی ممالک میں اُنھوں نے اس مسلک کو اختیار بھی کیا (اگرچہ اس پر محض مصنوعی طور پر عملدر آمد ہونے کی وجہ سے یہ برائے نام اور صرف رسمی شے رہا) اور ان کا جی چاہتا ہے کہ مسلم "ارباب حکومت" کا معیار عمل اور ماخذ افکار بھی آئندہ سے شریعت نہ رہے۔[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قوم کی مطلق العنان فرماں روائی کا یہ اُصول بھی ایسا ہی باطل و غلط ہے جیسے دوسری قسم کی فرمانروائیوں کے وہ اُصول جن پر ممالک یورپ میں پہلے عملدر آمد ہوتا رہا ہے۔ کیوں کہ یہ اُصول ایک مفروضہ حق پر مبنی ہے جو قوم نے خود اپنی رائے اور فیصلے سے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اپنے سابقہ خداوندان حکومت، یعنی کلیسیا اور بادشاہی کی نقالی کی ہے جو اپنی اپنی باری سے اور محض خود رائی سے، اپنی مطلق العنان وغیر ذمہ دار اور منزہ عن الخطا فرماں روائی کا نقارہ بجا چکے ہیں۔ تہ میں ان سب کی ایک ہی چیز تھی یعنی جبر و قہر۔ نتیجہ ان فرماں روائیوں کا ہمیشہ یہ ہوا کہ قوت و اقتدار کے لئے

---

[1] ہندوستان کی مفروضہ "قومی" تحریک بھی اسی نظریہ پر مبنی ہے۔ یعنی

(۱) ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔

(۲) آزادی سے مراد یہاں کی قوم کی فرماں روائی ہے۔

(۳) اس فرمانروائی کا نظام جمہوری ہوگا۔ اور

(۴) مذہب انسان کا ایک پرائیوٹ معاملہ ہے جسے امور سیاست کوئی تعلق نہیں۔

اس دعوائے "قومیت پرستی" کے برعکس مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے:۔

(۱) مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں جن کی تشکیل مذہب کے عناصر سے ہوتی ہے۔

(۲) آزادی سے مراد ایسی حکومت ہے جس کی بنیاد شریعت الٰہی پر ہو۔

(۳) جمہوری نظام مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہے اور

(۴) مسلمانوں کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں۔ "طلوع اسلام"

مسلسل کشاکش وجنگ ٹھن گئی ۔ منافرت نے معاشرت کو تلخ و زہرآلود بنادیا ۔ اور قوم کی طاقت بے سود خرچ ہوتی رہی ۔ غرض ایسی فرماں روائیاں ۔ فقط بیجا امتیازات ہیں جو جبراً و قہراً کوئی گروہ حاصل کرلیتا ہے ورنہ بذات خود ان میں کوئی ایسی عقلی یا اخلاقی خوبی نہیں ہے ۔ کہ انھیں قابل قدر اصول مان کر لوگ ان کے آگے سرجھکادیں ۔ وہ محض غاصبانہ قوت یعنی ظلم و ناانصافی کے مختلف پیرائے ہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ اصل اور جائز حق ہمیشہ کسی فرض کی بجاآوری سے پیدا ہوتا ہے ۔ وہ صرف فرض کی انجام دہی کا ایک معاوضہ ہے اور اگر ایسا نہ ہو ۔ تو پھر یہ مفروضہ حقوق غصب و ظلم ہیں ۔

اکثر حضرات یہ دعوٰے پیش کیا کرتے ہیں کہ انسان ماں کے پیٹ سے بہت سے قدرتی حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسی مجموعے میں ایک حق آزاد رہنے کا ہے ۔ اس بات کو عام طور پر آزادی پسندی اور روشن خیالی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط ، اور میں عرض کروں گا کہ آزاد خیالی کے معارض کوئی دعوٰی نہیں ہوسکتا ۔ آدمی کا کوئی "قدرتی حق" نہیں ہے قدرت کی طرف سے اسے صرف یہ قابلیت عطا کی گئی ہے کہ اپنے آپ کو حالات گرد وپیش کے موافق بنالے ۔ یعنی اس کی جسمانی اور روحانی یا اخلاقی زندگی جن قدرتی قوانین کے تابع ہے ۔ اس کا مشاہدہ کرے اور ان کے مطابق عمل کرے بالفاظ دیگر وہ فرائض ادا کرے جو ان قوانین سے اس پر عاید ہوتے ہیں ۔ فرض کی انجام دہی سے اسے رائے زنی کا حق حاصل ہوتا ہے ۔ اعمال حسنہ سے وہ عزت کا مستحق ہوتا ہے ۔ غرض اپنے تمدنی اور اخلاقی فرائض ہی کے ادا کرنے سے وہ ایک خاص حد تک آزادی کا حق کماسکتا ہے ۔ اور اس آزادی کی قدر و قیمت ۔ ٹھیک ٹھیک ان فرائض کی، جو وہ انجام دے ۔ اور جس طرح انجام دے ، حقیقی اخلاقی اور تمدنی قدر و قیمت کے مطابق معین ہوتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے شریعت کے ذریعہ انسان کو صرف ان ضروری اور اُصولی فرائض کی تعلیم دی ہے جن کے تمام و کمال ادا کرنے کی بدولت اسے کامل اور جاودانی مسرت سے بہرہ مند رہنے کا حق میسر آتا ہے ۔

قوم کی فرماں روائی ایک غلط خیال کے ارتقا سے وجود میں آئی ہے اور یہ ارتقا کا سلسلہ آگے چل کر اسے بھی اپنے سے پہلے اصول کی طرح ناپید و فنا کردے گا ۔ اس کے علاوہ وہ شے جسے جمہور یا قوم کی

مرضی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں صرف تعداد غالب کی مرضی ہے۔ حتیٰ کہ ممکن ہے وہ نصف افراد قوم کے ساتھ فقط ایک رائے کی بیشی سے حاصل ہوئی ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہایت کم اکثریت ہے جس کے مقابلے میں اتنی بڑی اقلیت موجود ہے۔ کہ قریب قریب اکثریت کے ساوی ہو، حاصل ہوسکتی ہے۔ پس قوم کی فرماں روائی کا اصول ماننا گویا حقیقت میں یہ تسلیم کرنا ہے کہ تعداد اکثرا اپنے سے کمتر تعداد کو زبردستی اپنی مرضی کا پابند بنانے کا حق رکھتی ہے۔ اور پھر مرضی یا رائے بھی ایسی جو ہر معاملے میں قانون حتمی کا حکم رکھتی ہے اور جس کے فیصلے کا کوئی مرافعہ اور داد فریاد نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی مطلق العنان رائے جس کی بنا محض کثرت تعداد ہو (یہ ماننے کے بعد بھی کہ یہ کثرت تعداد مصنوعی اور جعلی نہیں ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے) دوسرے اُصول حکومت کے مقابلے میں سب سے کم اس لائق ہے کہ اس کی حق کوشی اور دانش پژدہی پر بھروسہ کیا جائے۔

اگر تمہیں یہ یاد ہو کہ قرون گزشتہ میں یہی حق حکومت امرا یا دینی پیشواؤں کی تعداد قلیل کو حاصل رہ چکا ہے اور وہ اپنی رائے اور خوشی کے مطابق اس حق سے ناجائز کام لیتے رہے ہیں تو یقیناً تسلیم کروگے کہ قومی رائے کی حکومت اصل میں ایک انتقام ہے۔ جو اکثریت قلیل تر تعداد سے لے رہی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ انتقام آئندہ کسی دوسرے اور ایسے ہی بیجا انتقام کا راستہ تیار کرے۔

اس تقریر کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم قوم کی رائے کی جب کہ وہ صحیح طور پر ظاہر کیجائے، قدر و وقعت کو نظر انداز یا کم کرنے کے در پے ہیں۔ یا ہمیں اس بات سے انکار ہے کہ وہ بہت سے افراد کا مجموعی منشا ظاہر کرتی ہے جس سے اہلِ ملک کے احساس کا نہایت بیش بہا اندازہ ہوتا ہے یا ایسا انکار کرنا محض سفاہت ہوگی۔ قوم کا اظہار رائے کرنا یقیناً اپنے ایک حق سے کام لینا اور ایک مُلکی فرض کو ادا کرنا ہے۔ اور اس لئے اُس کا کافی احترام اور لحاظ ہونا چاہئے۔ لیکن اظہار رائے کا ہم کتنا ہی ادب ملحوظ رکھیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ دنیا میں جو چیز وجود رکھتی ہے خواہ اس کا تعلق تمدن سے ہو، خواہ جسمانیات سے؛ وہ قوانین فطرت کے تابع ہے۔ اور یہ کہ انسانی ارادہ و رائے کو ضرور ان

قوانین کی رہنمائی قبول کرنی چاہیئے جو ہر شے پر حکمراں ہیں۔ مآل اندیشی اور دانائی یہی ہے کہ آدمی کی رائے ان فطری قوانین کے موافق اور ہم آہنگ ہو۔ پھر جس طرح طبیعات کے میدان میں قومی رائے کی حکومت اور مطلق العنانی نہیں چلتی اور قوم وجمہور سب مجبور ہیں کہ طبیعی قوانین کے آگے سر اطاعت جھکائیں، تو اخلاق وتمدن کے میدان میں قومی رائے کی فرماں روائی اور خود مختاری کا دعویٰ کس طرح جائز ہوگا اس معاملے میں بھی قوم پر واجب ہے کہ فطرت کے قوانین کی اسی طرح متابعت کرے جس طرح دوسرے شعبوں میں کرنی پڑتی ہے، اسی کے ساتھ، چونکہ اخلاق وتمدن کے ان فطری قوانین کا تعین مشاہدے اور عقلی استدلال سے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا شریعت کی فرماں روائی پر ایمان لانا ناگزیر ہو جاتا ہے اور قومی فرماں روائی ایک ثانوی حیثیت اختیار کرتی ہے اور اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ شریعت کی اطاعت واحترام کرے۔

شریعت کی فرمانروائی کے نتائج۔ شریعت کی فرماں روائی کا اصول تسلیم کرنے سے نہایت اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سے تمدن ومعاشرت کی پوری عمارت بالکل نئی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ جو اُسے دوسرے تمدنوں سے صاف صاف ممتائز کرتی ہیں۔

اسلام کے اس تمدنی کام کا خلاصہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ اس نے ایک نظام معاشرت تیار کیا جس کے اجزائے ترکیبی، بالکل صاف اور صریح معنی مساوات وآزادی ہیں۔ اس نظام میں مختلف طبقات آبادی کی کوئی کشمکش باقی نہیں رہتی اور مساوات کا دعوےٰ کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہ وہ نظام معاشرت ہے جس نے بنی نوع انسان میں سب سے پرخلوص اور سچا رشتۂ اتحاد قائم کیا اور ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں اپنی آغوش میں لے کر "اسلامی برادری" کو وجود میں لایا کہ آجتک دنیا میں اس قسم کی کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی نہ ایسے نظام کی کوئی نظیر ملتی ہے جس نے تقریباً چالیس کروڑ نفوس انسانی کی ایک دنیا کی دنیا کو جس میں بالکل مختلف نسل اور بعید ترین ممالک کے لوگ شامل ہیں اس طرح ایک رشتۂ اتحاد میں باندھ رکھا ہو۔ مزید برآں اسلام میں یہ قابلیت تھی کہ تمام اقوام جو اس کے دائرہ میں آئیں۔ اس نے انھیں ایک مستقل مطمح نظر عطا کیا اور وہی ہمیشہ اُن کے ارتقار کی صدارت ورہنمائی

کرتا رہا۔ اسی کی برکت ہے کہ تیرہ سو برس کی طویل مدت میں جس میں مسلمانوں کے جاہ وجلال کا زمانہ بھی شامل ہے اور دورِ عسرت و انحطاط بھی، اسلامی قوموں کو برابر یہ دھن رہی کہ ان کا طرزِ عمل احکام شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اور وہ ہر زمانے میں جہاں تک ان سے بن پڑا شریعت پر چلنے کی کوشش کرتی رہیں اور سدا اپنی نجات کا ذریعہ اسی قانون کو سمجھتی رہیں۔

اسلام کے نظامِ تمدن کے قائم ہونے سے ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو ایسا وقار و اقتدار میسّر آگیا جو پہلے کہیں اور کسی زمانے میں اس کا حصہ نہ تھا۔ کیونکہ اسلام ہی نے حکومت کو قابلِ خوف اور لائقِ احترام ہونے کے ساتھ محبوب شے بنایا۔ اس کی محبوبی کا باعث یہ کہ وہ شریعت کی ساختہ پرداختہ شریعت کی) خادم اور شریعت کے احکام رائج و نافذ کرنے والی تھی۔ اس طرح اُس کے جواز میں کسی قیل وقال کی گنجائش نہ رہی اور اس پر غصب و قزاقی کے الزام کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا نہ اس سے خوف کا سبب، یہ کلّی اختیار و قوّت تھی کہ اس کے ماخذ و اصل پر کوئی حملہ نہ ہوسکتا تھا۔ اور وہ اخلاقی اور تمدنی حقائق کی علمبرداری کا مرتبہ رکھتی تھی۔ اس کا نام لے لے کے لوگوں نے جو بدعنوانیاں یا غلطیاں کیں وہ کبھی خود حکومت کی تکریم و توقیر میں جو شروع سے اسے حاصل رہی رخنہ نہ ڈال سکیں۔ نہ ان سے اس اعتماد میں فرق آیا جو حکومت کے متعلق دلوں میں جاگزیں تھا۔ ہر زمانہ میں اسلامی قومیں اسی اذعان ویقین پر جمی رہیں کہ جن مظالم اور خود رائی کے افعال کا وہ شکار ہو رہی ہیں وہ ہرگز شریعت میں داخل نہیں۔ نہ ان احکام و قوانین کے اندر ہیں جو شریعت سے اخذ ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ محض ایسے افراد کی شرارت وعصیاں کے کرشمے ہیں۔ جنہوں نے زبردستی حکومت پر قبضہ جما لیا اور قانون کے نام سے جو چاہا وہ کیا۔ ورنہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے احکام و حکام کے جواز میں مسلمانوں کو اختلاف کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا، نہ کبھی اس کی قدر و منزلت میں کمی کرنے کا میلان ہوا۔ اور حکومت کی خرابیوں اور غلط کرداریوں کے جس مداوی کی تلاش میں رہے، وہ یہ تھا کہ زمام حکومت ایسے حکمرانوں کے ہاتھ میں دی جائے جن سے باحوال ظاہر توقع ہوتی تھی کہ شریعت کے بہتر قائم مقام ہوں گے۔ اور احکام شریعت پر زیادہ اچھی طرح عملدرآمد کراسکیں گے۔

شریعت کی فرماں روائی کے اصول کے قطعی، درست اور حق ہونے کی یہ کیسی صاف اور کھلی دلیل ہے کہ وہ صدیوں تک برابر، بلا اختلاف و تغیرّ رائے کے مسلّم و محترم رہی۔ اس کی عملی خوبی اور صلاحیت نہایت حیرت انگیز طریقے سے اس طرح ثابت ہوئی کہ اسی نے تمدن کا وہ نظام پیدا کیا جو نوع انسان کی اجتماعی اور انفرادی ہر حیثیت سے کامل اور حقیقی رفاہ و خوش حالی کی جملہ شرائط پوری کرتا ہے۔ اس نے آناً فاناً گویا کوئی منتر پڑھ کر ان صدہا رکاوٹوں کو غائب کردیا۔ جو انسان کی تکمیل کی طرف قدم بڑھانے میں حائل تھیں اور چند ساعتوں میں ایک قابل تحسین و تعجب تہذیب کو موجود کردیا جو صدیوں تک دنیا کو علم و حکمت اور عدل و دانش کا سبق دے کر منور کرتی رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، جو قوم براہ راست ربانی قانون کی ماتحتی میں آئی اُس کے لئے اُس تہذیب نے عدیم النظیر اخلاقی فلاح اور مادی خوشحالی کا ذمہ لے لیا۔ (باقی)

*

تار یا مِضراب

راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد کے انتخاب صدارت کے موقع پر ہم نے لکھا تھا کہ اس سے کم از کم ایک فائدہ ضرور ہو گا یعنی اب ان کے آقایان نعمت انہیں مجبور کریں گے کہ وہ اپنے بے پناہ سکوت کے ان پردوں کو اٹھا دیں جن میں وہ اپنی موجودہ غیر اسلامی روش زندگی کو ایک عرصہ سے چھپاتے چلے آ رہے تھے چنانچہ سب سے پہلے ان کی مہر خاموشی نے نوازش دار دھاکے اس باطل آفریں ریکارڈ سے ٹوٹی جو نشرگاہ رام گڑھ کے صدارتی گراموفون سے سنایا گیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ تجربہ یاس انگیز ثابت ہوا اس لئے کہ ارباب کانگریس کی توقع کے خلاف راشٹرپتی صاحب کی جھجک پھر بھی پورے طور سے نہ اتری۔ اور اس کے بعد بجائے اس کے کہ وہ بہ کمال جلوہ درعنائی جلوہ بار ہوتے۔ اِدھر اُدھر کے گوشوں میں چھپتے چھپاتے پھرتے رہے۔ اور اگر کہیں مجبوراً شریک محفل ہونا بھی پڑا۔ تو کچھ اس انداز سے بجاتے شرماتے۔ سمٹے سمٹائے۔ نقاب کی اوٹ میں ایک طرف آکر بیٹھ گئے۔

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

لیکن اس حجاب و نقاب سے بھلا کام چل سکتا تھا؟ ہندوؤں۔ نے انہیں اس غرض سے راشٹرپتی تھوڑا بنایا تھا۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ جہاں انگریز سے سودا کرنا ہو وہاں گاندھی جی جایا کریں۔ اور جہاں مسلمانوں سے الجھنے کا موقعہ ہو وہاں شطرنج کے اس مہرے کو آگے بڑھا دیا جائے۔ اس باب میں آزاد صاحب کے لئے سب سے مشکل مرحلہ صرف مسلم لیگ کے روبرو آنا تھا۔ اس لئے کہ ایک تو آزاد صاحب خود اپنے من کے چور سے واقف ہیں۔ دوسرے وہ جانتے ہیں کہ مسٹر جناح سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کی ملت فروشی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ آزاد صاحب

کو خوب علم تھا۔ کہ جب دو برس ادھر گاندھی جی نے مسٹر جناح سے کہا تھا کہ مصالحت کی گفت و شنید کے لئے میں اپنے ہمراہ آزاد صاحب کو بھی لانا چاہتا ہوں۔ تو اس غیور جسور مرد حق گو نے بذریعہ تار متنبہ کر دیا تھا کہ اور جسے جی چاہے لائیے۔ لیکن آزاد صاحب کو ہرگز ساتھ نہ لائیے۔ میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا یہ تمام باتیں آزاد صاحب کے سامنے تھیں۔ اس لئے انہیں مسٹر جناح جیسے مرد خود دار کے سامنے آنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ لیکن انسان کی بعض مجبوریاں بھی کس قدر جگر سوز و جانکاہ ہوتی ہیں کہ اسے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جس کے نتائج و عواقب اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ مسٹر جناح کبھی اپنی طرف سے پہل نہیں کرتے۔ جناب آزاد مسلم لیگ کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کے لئے جن حرکات کے مرتکب ہوئے۔ وہ مسٹر جناح کے سامنے تھیں۔ بایں ہمہ انہوں نے آزاد صاحب کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ خاموش تھے۔ اور غالباً اس لئے خاموش تھے۔ کہ وہ آزاد صاحب کی مجبوریوں سے واقف تھے۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم وہ کونسی سخت مجبوری لاحق ہوئی کہ بقول غالب ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

آزاد صاحب نے اس پاسبانِ حصارِ ملت کو خواہ مخواہ جا چھیڑا۔ اور ایک تار بھیجا جس میں لکھا۔ بصیغۂ راز۔ آپ کا ۹ جون کا بیان (نظر سے گذرا) کانگرس کی قرارداد دہلی میں قومی حکومت سے دراصل ایک جامع کابینہ مراد ہے۔ جو کسی ایک خاص پارٹی تک محدود نہ ہو۔ لیکن کیا لیگ کی یہی پوزیشن ہے کہ وہ کسی ایسے عارضی انتظام پر متفق نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد دو قوموں کی اسکیم پر نہ ہو؟ اگر واقعی یہی مطلب ہے۔ تو براہ مہربانی بذریعہ تار اس کی وضاحت کر دیجئے۔" (ہندوستان ٹائمز بمبئی ۱۱)

ذرا سوچیئے کہ ایک شخص اس سے پیشتر برملا کہہ چکا ہے کہ حضرت! میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پھر وہ ان کی صدارت کی حیثیت سے بھی واقف ہے۔ چار دن نہیں گذرنے۔ کہ وائسرائے صاحب نے سیاسی گھتیوں کو سلجھانے کے لئے مسٹر جناح کو دعوت دی۔ تو دوسری طرف گاندھی جی کو بلایا۔

نیشنل کانگریس کے صدر صاحب کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ ایسے شخص کو یوں مخاطب کرنا اس کے سینہ کے زخموں کو کریدنا نہیں تو اور کیا ہے! اور پھر تار میں لکھا کیا؟ دنیا جانتی ہے کہ مسٹر جناح اور ہندؤں کے درمیان مابہ النزاع اصولی مسئلہ یہ ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم سمجھتے ہیں اور ہندو ان کے اس اسلامی دعویٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مسلم لیگ اور ہندؤں میں متعدد بار اختلافی مسائل کے متعلق مصالحت کی کوششیں ہوئیں۔ اور ہر بار بات یہیں آکر رک گئی۔ کہ ہندو مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور جس حکومت کو وہ قومی کہتے ہیں وہ درحقیقت ہندؤں کی حکومت ہے سو وہ بات جسے براہ راست منوانے سے ہندو قاصر آ گئے تھے۔ اب ایک مسلمان مُہرے کی طرف سے آگے بڑھائی گئی۔ ان حالات کے پیش نظر آپ خود اندازہ فرمایئے۔ کہ اس تار کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو مسٹر جناح پالیٹکس سے کام لیتے (کہ جسے قرآنی اصطلاح میں منافقت کہا جاتا ہے) اور دل میں بِس کی گھانٹ لیکن چہرے پر شہد کی سی بناوٹی شیرینی لئے ہوئے۔ نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتے کہ

"دعوت نامہ باعث ہزار عزت افزائی ہوا۔ یاد فرمائی کا بہ صمیم قلب شکریہ۔ اختلاف مسلک کے باوجود مجھے اس امر کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ملت اسلامیہ کی فلاح کے لئے جناب کی مساعی جمیلہ ہر فرزند توحید سے خراج تحسین حاصل کرنے کا حق رکھتی ہیں آپ کی مجوزہ سکیم بھی بہبودِ ملت کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ افسوس ہے کہ آجکل میری طبیعت کچھ ناسازسی ہے گھٹنے میں چوٹ آگئی۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے روک رکھا ہے آپ کی بلند پایہ سکیم چونکہ گہرے غور و تفکر کی مستحق ہے اس لئے میں اس پریشانیٔ خاطر کے زمانہ میں اس کے متعلق سوچنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ذرا سکون میسر آجائے تو اپنے خیالات گوش گزار کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔" آپ کا مخلص (محمد علی جناح)

اور یا وہ قلب و زبان کی ہم آہنگی سے کام لیکر ایک مردِ حق گو کی طرح جو کچھ دل میں تھا کھلے کھلے الفاظ میں کہدیتے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ہر طرف سے ستائش و توصیف کے نعرے بلند ہوتے۔ بلندیٔ اخلاق کے قصیدے پڑھے جاتے۔ ہر دلعزیزی حاصل ہوتی جناب آزاد صاحب خوش ہو جاتے اور ان کے حواریین

بشاش۔ اور دوسری صورت میں دنیا بھر کی برائی اور دشنام طرازی۔ ظاہر ہے کہ مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ پہلی صورت اختیار کی جاتی نفس کا بت اسی کی تلقین کرتا ہوگا۔ کہ ہر دلعزیزی بڑی دولت ہے لیکن حق و صداقت کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ پھر مسٹر جناح نے کیا کیا؟ وہی کیا جو ایک مسلمان کو کرنا چاہیئے۔ انہوں نے مصلحت کوشی اور نفسِ فریب کار کی حیلہ جوئی کو جھٹک کر الگ کر دیا اور قلب و زبان کی کامل ہم آہنگی سے وہ جواب بھیجا جو ہندوستان کی سیاست میں حق گوئی و بے باکی کی اپنی مثال آپ ہے انہوں نے "تار کا جواب تار میں بھیجا" ایک تو مسٹر جناح کی زبان، اس پر تار کا ایجاز۔ ہندوؤں کی ابلہ فریبی اور مسلمان تومیت پرستوں کی ملت فروشی کی داستان چند الفاظ میں یوں قلمبند کر دی کہ شاعری اس پر سر دُھنے اور ادب وجد میں آجائے۔ افسوس کہ اس تار کا لفظی ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ اور مفہوم کی ادائیگی کے لئے ان الفاظ کو پھیلانا گویا خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتیوں کا تجزیہ کرنا ہے بہرحال اس جواب کا آزاد ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کا تار ملا۔ میں اس رازداری کا قائل نہیں۔ چونکہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد کلیتہً کھو چکے ہیں اس لئے میں بذریعہ خط و کتابت یا کسی اور نہج سے آپ سے ان معاملات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آپ کو ایک نمائشی صدر بنانے سے ہندوؤں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ کانگریس یقیناً ایک قومی جماعت ہے اور اس طرح باہر کی دنیا کو دھوکا دیا جائے۔ آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے۔ کانگریس ہندو جماعت ہے اس لئے اگر آپ کو عزت نفس کا کچھ پاس ہے تو اس جماعت سے فوراً مستعفی ہو جائیے اس وقت تک اپنے لیگ کی تخریب کے لئے اپنی انتہائی کوشش کر دیکھی اور آپ کو علم ہے کہ آپ کس طرح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں اب ان حرکات کو چھوڑ دیجئے۔"

اگر ہمارے قومیت پرست مسلمانوں میں حق سننے کی تاب ہوتی تو مسٹر جناح کی اس صاف گوئی پر ہدیہ تبریک پیش کرتے (لیکن اگر انہیں حق کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا تو اس باطل پرستی کی روش پر کیوں اڑے رہتے) مسٹر جناح کا تار، تار نہیں۔ مضراب تھا جس سے ان سینے کے خاموش سازیوں جھنجھنا اٹھے۔ گویا ؎

نغمے بے تاب تھے تاروں سے نکلنے کے لئے

قیامت کا شور برپا ہو گیا کہ دیکھو صاحب! یہ جواب کس قدر خلاف تہذیب ہے۔ لب و لہجہ کتنا درشت ہے حضرت امام الہند کی شان اقدس میں کیسی سوء ادبی ہے ۔ وہ برگزیدہ ہستی جو نہ صرف مسلمانان ہند۔ بلکہ مسلمانان عالم کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ اس کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ کوئی اخبارات میں بیان شائع کرا رہا ہے۔ کسی کو دیکھئے تو بر سر منبر آنسو بہا رہا ہے۔ کوئی اسٹیج پر کھڑا عوام کے جذبات بھڑکا رہا ہے جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ اس کے خلاف ریزولیوشن پاس کرتی ہے۔ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں اور اس میں اس جواب کو خلاف اسلام بتایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔ ہندوستان ٹائمز بابت ۴ ر جولائی لغایت ۱۸ ر جولائی (جس دن یہ سطور سپرد قلم کی جارہی ہیں)۔

ان حضرات سے پوچھیئے کہ ذرا سنجیدگی اور متانت سے غور کر کے بتائیں کہ اس جواب میں کونسی بات خلاف اسلام اور خلاف تہذیب ہے جس پر یوں شور مچایا جارہا ہے۔ اس میں گالی تو ایک طرف سوقیانہ پن کی بھی کوئی بات نہیں غور فرمایئے کہ اس تار میں اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ ایک حقیقت کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے ۔ منافقت کے خوش آئند پردوں میں نہیں چھپایا۔ کالے کو کالا کہدینا اگر گالی ہے تو پھر سچ کے لئے دنیا میں کوئی لفظ باقی نہیں رہے گا۔ اگر جھوٹے کو جھوٹا کہدینا خلاف تہذیب ہے تو اسلام کے لغت میں ایسی تہذیب کے لئے منافقت و مداہنت کے سوا اور کیا لفظ ملے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات جو تہذیب و اخلاق کے نام پر یوں تڑپ اٹھتے ہیں۔ گویا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انہیں معلوم ہی نہیں کہ اسلامی تہذیب اور قرآنی اخلاق کہتے کسے ہیں! ہمارے ہاں یورپ سے جہاں اور لعنتیں آئیں ۔ وہاں ایک بہت بڑی لعنت تہذیب اور اخلاق کا غلط نظریہ بھی ہے۔ یورپ کا معیارِ تہذیب یہ ہے کہ سوسائٹی کے عیب کو عیب کبھی نہ کہو۔ کسی پر نکتہ چینی نہ کرو۔ آپ کے سامنے ایک شخص کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن اخلاق کا تقاضا ہے کہ اسے ٹوکئے نہیں۔ آپ کے دل میں کسی کے خلاف لاکھ جذبات منافرت موجزن ہوں لیکن اس سے جب ملئے نہایت خندہ پیشانی سے ملئے۔ اندر سے دل مار سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا ہو لیکن ہنس کر کہئے کہ آپ کی ملاقات سے بیحد مسرت ہوئی۔ غرضیکہ آپ

جس قدر منافقت برتئے اتنے ہی "پاپولر" (ہر دلعزیز) ہو جائیے ۔ یہ تھا یورپ کا نظریہ تہذیب و اخلاق جو مغرب سے اٹھا اور مشرق کے آب و گل میں سرایت کر گیا ۔ ہندوستان کی سیاسی فضاء میں "مہاتمائیت" کے چولے نے اس نظریہ کو تقدس کا رنگ دے دیا اور دل میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے بد ترین دشمن اور بظاہر مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ سینہ میں پراچین تہذیب کے احیا اور رام راج کے قیام کے منصوبے اور زبان پر متحدہ قومیت اور آزادئ ہند کے تذکرے خلوت میں آتش انتقام سے شعلہ در پیرہن اور جلوت میں ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت یہ رنگ سیاست اوپر سے نیچے کو گرا ۔ اور تمام فضا کو ملون کر گیا حتیٰ کہ بڑے بڑے ارباب کانگریس کی یہ کیفیت ہے کہ عدم تشدد (اہمسا) کو مدتوں بطور عقیدہ تسلیم کرنے کا اعلان کرتے رہے مگر دل میں اس کی سچائی کا کبھی یقین نہیں رکھا ۔ حال ہی میں کانگریس کے ریزولیوشن متعلقہ عدم تشدد پر جب یہ خیال پیدا ہوا کہ کانگریس نے اپنا قدیم مسلک چھوڑ دیا ہے تو اس پر امرت بازار پترکا جیسے اخبار نے لکھا کہ

> "حقیقت یہ ہے کہ ارباب کانگریس میں سے اکثریت ایسوں کی ہے جنھوں نے عدم تشدد کو کبھی بطور عقیدہ کے تسلیم نہیں کیا بلکہ محض حکمت عملی کے طور پر مانتے رہے ۔ اور اگر سچ کہا جائے ۔ تو یہ لوگ جو اس امر کا اعلان کرتے رہے کہ ہم خیالات الفاظ اور اعمال میں عدم تشدد کے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں ۔ تو یہ اعلان کسی دیانت دارانہ قلبی یقین پر مبنی نہ تھا بلکہ محض مہاتما گاندھی کے جذبات کی رعایت سے تھا" (اسٹیٹسمین بمبئی ۱۲)

مغرب کی مادہ پرستی اور ہندوستان کی سیاسی حکمت عملی کا یہی وہ معیار اخلاق و تہذیب ہے جو ہمارے قومیت پرست حضرات کے دل و دماغ پر مستولی ہے اور جس کی بناء پر ان میں حق کہنے کی تو ایک طرف حق سننے کی بھی ہمت باقی نہیں رہی ۔ اسی ماؤف قلب و نظر کا نتیجہ ہے وہ ہنگامہ جو مسٹر جناح کے جواب کو خلاف تہذیب اور خلاف اخلاق قرار دے رہا ہے ۔ سچ فرمایا تھا حضرت لسان العصر نے ؎

مغوی کو کرامت کہو ترغیب ہے یہ　　　یہ کس سے کہوں نفس کی تخریب ہے یہ
شیطاں کو رجیم کہہ دیا تھا ایک دن　　　اک شور اٹھا خلاف تہذیب ہے یہ

یاد رہے کہ ان میں کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے خلاف حقیقت ہے شکایت

صرف یہ ہے کہ اس جواب کا پیرایۂ بیان سخت ہے طرز ادا درشت ہے ان علمبرداران تہذیب و اخلاق نے جناب آزاد کی حمایت میں اس قدر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور مسٹر جناح کے جواب کو اسلامی معیار تہذیب و اخلاق کے خلاف قرار دے دیا لیکن ہمیں حیرت ہے کہ ان ارادتمندان بے بصر نے خود جناب آزاد سے کیوں نہ پوچھ لیا کہ قرآنی معیارِ اخلاق و تہذیب کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر جناح کے جواب کے بعد خود جناب آزاد کی یہ حالت ہے کہ ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!

لیکن کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ جناب آزاد تمام معاملات کو کتاب و سنت کے آئینہ میں دیکھا کرتے تھے۔ اور جو کچھ اس میں دکھائی دیتا۔ پورے جوشِ خطابت سے کہہ دیا کرتے تھے۔ سنئے کہ اس باب میں ان کا اپنا ارشاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اسلام نے حق پرستی کی جو تعلیم دی ہے۔ وہ دنیا کے موجودہ اخلاق کی مدعیانہ حق پرستی سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے، قرآن حکیم اور اسوۂ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہمیں حق کا اصول بتلا دیا ہے۔ ایک طرف تو یہ تعلیم دی فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں مخالفوں کے ساتھ نرم دل بنا دیا ہے کہ باوجود ان کی سختی و قساوت کے تم حسن اخلاق و صبر و تحمل سے پیش آتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی تمہارے پاس نہ آتا۔ دوسری جگہ حکم دیا، واغلظ علیھم باطل پرستوں کے ساتھ نہایت سختی کرو۔ کہ وہ نرمی کے مستحق نہیں۔

پہلا موقعہ تو عام طور پر حسن خلق، کشادہ روئی، صبر و تحمل۔ نرمی طبیعت۔ تہذیب لسان و لہجہ سخن کا تھا لیکن دوسرا موقعہ حق و باطل، صدق و کذب، اور ایمان و کفر کے مقابلے کا تھا۔ فرمایا کہ جس قدر سختی کر سکتے ہو کرو۔ کہ عین عدل و اخلاق ہے۔

چنانچہ سورۂ قلم میں ایسی نرمی کو جو حق و صداقت کے خلاف ہو۔ اور راہ عدالت سے منحرف کر دے "مداہنت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ ودوا لو تدھن فیدھنون بعض کفار آنحضرت (صلعم) کے پاس جمع ہو کر آئے اور کہا کہ بہتر ہے۔ کہ ہم میں اور آپ میں ایک راضی نامہ ہو جائے ....

آپ جو کچھ تعلیم دینا چاہتے ہیں دیجئے لیکن صرف اتنا کیجئے کہ ہمارے بتوں کو اور ہماری بت پرستی کو برا نہ کہئے۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو مال و دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ بلکہ حجاز کا بادشاہ تسلیم کر لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اس نے جو نہ صرف ریگستانِ عرب کا بلکہ تمام بر و بحر عالم کی ہدایت کا شہنشاہ ہونے والا تھا بیساختہ جواب دیا۔ لو جعلتمونی بالشمس حتی تضع فی یدی ما سألتکم غیرھا (بخاری) عرب کی بادشاہت تو کیا شے ہے؟ اگر تم سورج کو بھی آسمان سے اتار کر میری مٹھی میں رکھ دو۔ جب بھی میں سوائے کلمۂ حق کے دوسری بات منظور نہ کروں گا۔

خدائے تعالیٰ نے اسی مصالحت اور نرمی کی خواہش کی نسبت فرمایا ودوا لو تدھن فیدھنون یہ باطل پرست کہتے ہیں کہ تو ان کے ساتھ اعلان حق میں نرمی کر۔ تو وہ بھی تیرے ساتھ نرمی کریں گے حالانکہ کفر کو راضی رکھکے ایمان کی دعوت کبھی نہیں دیجا سکتی۔ فلا تطع المکذبین پس ان لوگوں کی خواہشوں کی اطاعت نہ کرو۔ جو حق و عدالت کو جھٹلانیوالے ہیں"۔ (الہلال ۲/۱۴ ۱۴)

یہ اصول تھا۔ اب اس کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ بالعموم طبیعتیں مدح و تحسین کی عادی ہو گئی ہیں نکتہ چینی اور انتقاد و اعتراض کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے۔ تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح و منقبت کا ترانہ سنائے۔ اور بادۂ تحسین و آفرین کی پے درپے بخشش سے ساقی کا ہاتھ کبھی نہ تھکے۔ شرک و بت پرستی کے اس عام سکون میں اگر کوئی صدائے توحید خلل انداز ہوتی ہے۔ تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیمی پیشرو کی طرح لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنک من المسجونین "اگر میرے سوا کسی دوسری ذات کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کر دوں گا (۲۶ - ۲۹) کا غل مچ جاتا ہے۔ اور صرف یہ معبودانِ باطل ہی نہیں بلکہ ان کے پرستار بھی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ایک قدیمی سنت ہے اور دنیا میں جب کبھی سچائی آئی ہے۔ تو اس کو ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے فما کان جواب قومه الا ان قالوا حرقوه وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین۔ (۲۱ : ۶۸)

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں

پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے گالیاں دینا کوئی اچھی عادت نہیں۔ اختلاف رائے ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ مخالف آرار رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔ پھر اگر ایسا کرنے کے لئے آپ مجبور ہیں۔ تو ذرا لہجہ نرم کیجئے۔ اور شکایت بھی کیجئے۔ تو شکر کے لہجہ میں کیجئے۔ نرمی اور محبت سے کام نکلے۔ تو سختی دکھلانا شان شرافت نہیں۔ آج کل بھی کہ ہوشیاری و بیداری کی نہیں۔ تو خماری و سرشاری کی ایک کروٹ تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے۔ نکتہ چینیوں کی باتوں کو ایسے ہی ظاہر فریب اور اخلاق نما جملوں سے بند کیا جارہا ہے۔ پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً اس مسئلے پر غور کریں کہ فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے یا نہیں ؟ کسی کو برا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں۔ دل محبت کے لئے ہے نہ کہ عداوت کے لئے۔ لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی اور بھلائی ہوسکتی ہے ؟

سب سے پہلے اسے اخلاق کے عام اصول کے لحاظ سے دیکھئے جب بھی فیصلہ صاف ہے دنیا میں جس دن اخلاق نے کہا کہ نیکی کو نیک اور نیک عمل کو اچھا کہو۔ کیونکہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی وقت اس نے ضمناً یہ بھی کہدیا۔ کہ نیکی کی خاطر بدی کو برا اور بد عمل کو قابل نفرت سمجھو۔ کیونکہ نیکی کو اس کا حق تحسین مل نہیں سکتا جب تک بدی کو اس کی سرزنش اور نفرین نہ مل جائے۔" (الہلال ۱۱ اگست ۱۹۱۲ء)

پیرایۂ بیان اور طرز ادا کے متعلق بھی سن لیجئے فرماتے ہیں۔

"(حق) اور (باطل) دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں میں سے کسی ایک کو پسند کر لیجئے اگر حق کی راہ اختیار کی ہے۔ تو پھر مصلحت پیرایۂ بیان، طرز ادا، الفاظ شہد نما و معانی زہر آلود، اور اسی قبیل کی تمام باتوں کے لئے نفاق کے سوا اور کوئی لقب نہیں۔ سچ کہیے گا تو جھوٹ کو چوٹ ہی لگے گی۔ اس کو بچانے کی کوشش نہ کیجئے۔ ورنہ آپ کفر سے زیادہ دنیا کے لئے ہلاک ہیں نرمی اور آشتی، حسن ادا، پیرایۂ بیان مصلحت بینی۔ اور مقتضیات زمانہ

کے اگر یہی معنی ہیں۔ جو بتلائے جاتے ہیں۔ تو خدا کے لئے ہمیں سمجھائیے کہ پھر نفاق و منافقت کے اور کیا معنی ہیں؟ اگر ایک بات سچ ہے۔ تو اس کو صاف صاف کہدیجئے۔ اگر کچھ لوگ برے ہیں تو کھول کھول کر ان کی برائی بیان کر دیجئے۔ بری باتوں کے اظہار کے لئے اچھے لفظ کیوں اختیار کئے جائیں؟ بداعمالوں کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ نیک کرداروں کے حقوق کا مطالبہ کریں؟ اگر یہ طریقہ پسند نہیں۔ تو پھر بتوں کو آستین میں چھپانے کی جگہ بہتر ہے کہ سر پر جگہ دیجئے۔ ظاہر و باطن میں مطابقت، جھوٹ میں بھی ہو تو سچائی سے خالی نہیں۔

بس کافر ست زاہد از برہمن ولیکن — اور ابت امنت در سر در آستین ندارد

یا یھا الذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اما نتکم وانتم تعلمون ط......

"مشکل یہ ہے کہ لوگ تیشے کی ضرب کی سختی کو دیکھتے ہیں مگر اسے نہیں دیکھتے۔ کہ عمارت کی بنیاد بھی تو برسوں کی پرانی ہے، اگر پرانی بنیاد کو اکھاڑنا مقصود ہو تو اس پر ابتدا کی ضربیں سخت سے سخت لگائیے، جب جڑ ہل جائے گی۔ تو پھر آپ کو اختیار ہے، انگلیوں سے مٹی ہٹا کر اینٹوں کو ایک ایک کر کے اٹھا لیجئے گا لیکن اگر پہلی ضرب ہی سست پڑی۔ تو پھر برسوں میں بھی نئی عمارت کے لئے جگہ صاف نہ ہو سکے گی۔ یہی سبب ہے۔ کہ ہم اس وقت اپنے کاموں کے لئے سخت سے سخت تلخی کو بھی نرمی سمجھتے ہیں، جہاں تک کندھوں میں زور رہو، جلد جلد ضربیں لگاتے جائیے۔ زمانے کا سیلاب بھی آپ کی مدد کے لئے تیزی سے اُمڈا آرہا ہے، اگر آپ نے اپنا کام پورا کر دیا تو پھر آپ کو ہمیشہ کے لئے فرصت ہے، یہ سیلاب خود بنیاد کی مٹی تک بہالیجائے گا" (الہلال۔ ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے! جس چیز کو آپ تہذیب و اخلاق کہتے ہیں وہ قرآنی زبان میں بقول جناب آزاد منافقت کہلاتی ہے۔ آج ہمارے ان علمبرداران دین و شریعت کے سینہ میں آتش غیظ و غضب اس لئے شعلہ بار ہے کہ مسٹر جناح نے منافقت کیوں نہیں اختیار کی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب فرماتے ہیں۔

یقیناً مسٹر جناح کسی اور ہی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہمارا کلچر نہیں ہے اور کسی اور قوم کی

جو ہماری قوم نہیں ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴ جون)

بالکل بجا اور درست آپ نے خود جناب آزاد کے الفاظ میں سن لیا کہ اسلامی کلچر اور تہذیب کیا ہے اور آپ حضرات کا اسلام اور اس کی تہذیب کیا ہے! مسٹر جناح کے جواب میں کوئی لفظ دشنام طرازی کا نہیں لیکن سنیئے کہ ایسے مواقع پر امام الہند صاحب کن الفاظ میں اظہار جذبات فرماتے ہیں۔ حضرات علماء کرام زیادہ توجہ فرمائیں کہ روئے سخن انہیں کے ایک گروہ کی طرف ہے ارشاد ہے۔

"سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے، یہی حال ان سگان دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے۔ جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے۔ اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی دیتی ہے فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں، اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ نمائی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھکر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی اور امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خون خواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح ؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غرّاتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے"۔ تذکرہ صـ ۸۳، ۸۴

حقیقت یہ ہے۔ کہ مسٹر جناح کا بار ایک آئینہ تھا جس میں قومیت پرست حضرات کو اپنے صحیح خدوخال نظر آئے لیکن وہ تھے اتنے بھیانک کہ انہیں دیکھ کر یہ حضرات بلبلا اٹھے۔ ایسے میں اگر دماغی توازن قائم رہتا تو توجہ اپنے بگڑے ہوئے چہرے کی اصلاح کی طرف منعطف ہوتی لیکن دفور غضب نے عقل و ہوش کو مسلوب کر دیا۔ آئینہ توڑ ڈالا اور آئینہ نما کو کوسنے لگے اتنا نہ سوچا کہ آئینہ توڑ دینے اور آئینہ نما کو برا بھلا کہدینے سے مسخ شدہ چہرہ تو درست نہیں ہو جائے گا کبھی وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اعلان کرتے تھے کہ جو شخص مجھے میرے عیوب سے آگاہ کریگا میں اس کا شکر گذار ہوں گا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ تنبیہ کرنے والے کو حوالۂ دار و رسن کیا جاتا ہے اور طبائع اس قدر مداہنت و منافقت کی خوگر ہو چکی ہیں۔ کہ حقیقت کو اس کے اصلی رنگ میں بیان کر دیا جائے تو آپ سے بگڑ بیٹھتے ہیں اور خوش اس سے ہوتے ہیں۔

"کہدے کوئی الو کو اگر رات کا شہباز"

کہا جا سکتا ہے کہ جناب آزاد اور دیگر قومیت پرست حضرات کا مسلک ملک فروشی اور غداری نہیں محض طریق کار کا اختلاف ہے مقصد ان کا بھی مسلمانوں کی فلاح و سعادت ہے۔ اسلام کی سرفرازی و سربلندی ہے بجا اور درست ہ

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن سوال یہ ہے۔ کہ اس امر کا فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ کہ ان حضرات کی روش ملت فروشی ہے یا اسلام دوستی؟ ورنہ یوں تو میر جعفر سے بھی پوچھتے تو وہ بھی یہی کہتا کہ میں نے جو کچھ کیا قوم کی بہتری کے لئے کیا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لئے اس باب میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے ہر اختلافی مسئلے کا فیصلہ خدا کی کتاب مبین کی رو سے ہو گا۔ ہم مسلسل اڑھائی برس سے جناب آزاد کی اپنی تحریروں سے ثابت کرتے چلے آرہے ہیں۔ کہ کتاب و سنت کی رو سے قومیت پرستوں کا موجودہ مسلک یکسر غیر اسلامی ہے۔ جناب آزاد اپنے دور قومیت پرستی سے پیشتر ایک عرصہ تک اپنی موجودہ روش کو عہد جاہلیت کی روش قرار دیتے رہے۔ کانگریس کی شرکت کفار کی دوستی غیر مسلموں کی رہنمائی۔ متحدہ قومیت وغیرہ کو کفر و باطل کی راہ بتاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی باطل کی راہ اختیار کر لی۔ تو قوم کے مسلسل تقاضوں کے باوجود انہوں نے اس مسلک کے جواز میں کتاب و سنت سے ایک دلیل بھی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی فرمایئے! اس کے بعد مسلمان

کس طرح اپنے آپ کو دھوکا دے لے۔ کہ ان کا (ابوالکلام) اور دیگر قومیت پرست حضرات کا (مسلک اسلام کے مطابق ہے۔ جو کچھ پہلے ہوا۔ اس کو چھوڑ دیجئے۔ ہم جناب راشٹرپتی ابوالکلام صاحب۔ آزاد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں قرآنی سند پیش کریں۔ اس کے بعد ہم انشاء اللہ نصوص صریحہ اور خود ان کی تحریروں سے ان کے دعوے کی تردید کریں گے۔ دنیا خود دیکھ لے گی کہ حق و صداقت کی راہ کونسی ہے پچھلے دنوں جناب حسین احمد صاحب مدنی مونگیر تشریف لے گئے۔ وہاں جناب عبدالقدوس صاحب بہاری نے انہیں چیلنج دیا۔ کہ وہ اپنے مسلک قومیت پرستی کے متعلق ان سے تحریری یا تقریری مناظرہ کریں۔ جناب مدنی صاحب شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (منشور مورخہ ۳۰ جون ۴۶ء) یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے اور اس پر مطالبہ یہ ہے کہ قوم آنکھیں بند کئے ان کے پیچھے پیچھے چلی آئے۔ اب فرمایئے کہ مسٹر جناح کی حقیقت گوئی انہیں کیوں نہ کڑوی معلوم ہو گی ؎

گر فہم حضرت ملامتش رو ستت	نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم	مرا از کعبہ میرانند حق اوست

باقی رہا یہ دعوے کہ جناب آزاد صاحب کو تمام مسلمانان ہند کا اعتماد حاصل ہے۔ سو اس کا امتحان بھی بہت آسان ہے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں کے ارباب حکومت سے بھی آزاد صاحب کی سازباز ہے وہ آئیں اور پنجاب کے صدر مقام لاہور سے کسی انتخاب کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ دنیا کو حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ جناب کو کتنا اعتماد حاصل ہے۔ اور مسٹر جناح نے کس قدر سچ کہا ہے کہ

"آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے"۔

اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

حقائقِ و عبر

اسلامی کلچر کے محافظ جمعیت العلمار ہند کو دعوٰے ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی کلچر کے محافظ ہیں اور جب ملک کو سوراج ملیگا تو وہ اُس وقت ایک الگ شعبۂ حکومت قائم کریں گے ۔جس کا منصب اسلامی کلچر کا تحفظ ہوگا ۔ یہ تو دعوٰے ہے۔ اب اس کی دلیل ملاحظہ فرمائیے ۔جون سنہ ۱۹۴۵ء میں جمعیت العلمار کا بارہواں سالانہ جلسہ بمقام جونپور منعقد ہوا۔ اس جلسہ کا اشتہار حسبِ ذیل ہے :-

"آپ کو جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ ہمارے شہر میں جمعیت العلمار ہند کا بارہواں سالانہ جلسہ اوپر لکھت تاریخوں میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی صدارت میں ہوگا ۔جس میں دیش کے سب ہی بڑے بڑے مسلم نیتا آویں گے ۔ یہ آپ کو بھلی بھانتی گیات ہے ۔ کہ جمعیت العلمائے ہند ایک ایسی سنستھا ہے جس نے سروداً (؟) کانگریس کا آزادی کی لڑائی میں ساتھ دیا ہے اور اب بھی دیش کی آزادی کے لئے مسلم جاتی کی نیتر تو کر رہی ہے ۔ ات آپ سے سن رودھ پرارتھنا ہے کہ اس سمیلن کو سپھل بنانے کے لئے اس میں بڑی سے بڑی تعداد میں اِک ترت ہو کر سمیلن کو سپھل کیجئے ۔

پروگرام نیم لکھت ہے ۔

۷ر جون کو چار بجے جونپور اسٹیشن سے سبھاپتی کا جلوس نکلے گا ۔

۷ر جون سیانکال آٹھ بجے اٹالہ مسجد میں کھلا ادھویشن ہوگا ۔

۸ر جون صبح آٹھ بجے اجرار سواین سیوک سمیلن ہوگا ۔

۸ر جون چار بجے کھلا ادھویشن ہوگا

۸ر جون آٹھ بجے جمعیت العلمار کا کھلا ادھویشن ہوگا۔

۹ر جون آٹھ بجے احرار سوا ین سیوک سمیلن ہوگا۔

۹ر جون ۴ بجے کھلا ادھویشن ہوگا۔

۹ر جون رات آٹھ بجے جمعیت العلمار کا کھلا ادھویشن ہوگا۔"

غور فرمایا، آپ نے! یہ ہے وہ "اسلامی کلچر" جس کے تحفظ کے ذمہ دار ہمارے نیشنلسٹ علمائے عظام ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ ۱۸/۱۰۳-۱۰۴ -

"کہو کہ۔ آؤ ہم تمہیں خبر دیں کہ وہ کون ہیں جو اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؛ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں۔ وہ اس دھوکے میں پڑے رہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں بہت ٹھیک ہے۔"

یہ تو ہیں مسلمانوں کے حقوق کے محافظ اور اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ پونہ کا اخبار مرہٹہ رقم طراز ہے:۔

"اردو زبان تو کبھی ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ ہندوؤں کے شاستر میں ان کو مسلمانوں کی زبان بولنے سے روکا گیا ہے۔" ("ہماری زبان"۔ یکم جولائی ۱۹۴۲ء)

جمعیۃ العلمار نے بتا دیا کہ اگر اردو ہندوؤں کی زبان نہیں ہوسکتی تو ہندی تو مسلمانوں کے علمار کی زبان ہوسکتی ہے۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ہندوؤں کے شاستر مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ ورنہ اُن میں یہ کیسے لکھا ہوتا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی زبان نہیں بولنی چاہئے۔

وفاداری بشرطِ استواری کانگریس نے ریزولیوشن پاس کر دیا کہ عدم تشدد (اہنسا) پر ان

عقیدہ نہیں رہا۔ تمام کانگریسی خوش ہوئے کہ اُنھوں نے ایک عرصہ کے مسلط شدہ زنانہ پن سے نجات پائی لیکن ان ہی میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جن کی گاندھی جی کے ساتھ عقیدت ایمان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ جب گاندھی جی کا ایمان اٹھنا ہے تو اس نیاز مند کا ایمان کچھ اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس لئے گاندھی جی کانگریس سے الگ ہوئے تو لیجئے یہ میرا استعفیٰ بھی حاضر ہے۔ یہ "پہنچے ہوئے" بزرگ جناب خان عبدالغفار خاں صاحب ہیں جو "سرحدی گاندھی" کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ بہر حال ایمان نہیں کفر ہی سہی۔ پختگی تو حاصل ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　　مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

غالباً خان صاحب یہ وصیت بھی کر جائیں گے کہ بعد مرگ ان کی مٹی بھی گاندھی جی کے چرنوں میں دبائی جائے کہ ان کا "جیون سپھل" ہو جائے۔ خان صاحب اپنی فوج کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

"خدائی خدمتگاروں کو وہی ہونا چاہیے جو اُن کا نام ظاہر کرتا ہے۔ خدا اور مخلوق کے خالص خادم اپنی جان دینے والے لیکن کسی کی جان نہ لینے والے۔ (ہندوستان ٹائمز ۹ جون)

یہ تو ہے سرحدی گاندھی کی خدائی فوج کے سپاہیوں کی تعریف (اپنی جان دینے والے لیکن کسی کی جان نہ لینے والے) لیکن سچے خدا کی فوج کے سپاہیوں کے اوصاف کچھ اور ہیں۔ ان کے لئے ارشاد ہے:۔

يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون ۔　　　وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے میدان جنگ میں نکل آتے ہیں پھر وہ (دشمنان اسلام کو) قتل کرتے ہیں یا خود میدان جنگ میں جان دیدیتے ہیں۔

خان صاحب سے پوچھئے کہ ان کے سپاہی کون سے "خدا" کی فوج ہیں۔ اس لئے کہ قرآن حکیم نازل کرنے والے خدائے حقیقی نے تو اپنے سپاہیوں کے اوصاف "خدائی خدمتگاروں سے بالکل متضاد بیان کئے ہیں۔

بہر حال۔ ایمان جاتا ہے تو جائے۔ سرحدی گاندھی صاحب نے شہرت تو حاصل کرلی! یہ بڑی نعمت ہے۔ جسے شیطان دے۔

من چہ می سرائم و طنبورۂ من چہ می سراید کانگریس کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بیان میں کہا کہ :-

"ملک میں بیرونی حملہ کا خطرہ بالکل واہمہ کی تخلیق ہے ۔ اور نہ ہی میں اندرونی خلفشار کا کوئی خوف محسوس کرتا ہوں ۔"

ایک طرف پنڈت جی یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف گاندھی جی یہ لکھ رہے تھے :-

"کانگریس نے اپنے گزشتہ اجلاس میں وہ راہ عمل متعین کرلی تھی جس سے ایک طرف وہ اندرونی خلفشار کا مقابلہ کرسکیں اور دوسری طرف بیرونی حملہ کا خطرہ دور کرسکیں ۔" (آئی آئی ۔ بجم ۷)

کہئے ! کوئی کس کی مانے ؟

⁂

عصمت بی بی از بیچارگی گاندھی جی نے ہریجن میں کسی صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے ۔ جس میں وہ صاحب رقم طراز ہیں ۔

"کانگریس والے اس لئے عدم تشدد پر کاربند رہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے ظالم کے خلاف تشدد برتا تو اس سے وہ اور مشتعل ہوگا اور ایسی سختی کرے گا جسے یہ برداشت نہ کرسکیں گے ۔ کانگریس والوں کے مسلک عدم تشدد کا محرک جذبہ یہ نظر آتا ہے ۔ جو یقیناً بزدلی اور دون ہمتی کا آئینہ دار ہے نہ کہ محبت کا ۔ کیونکہ جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ کسی طرح اپنی جان بچانے کی فکر ہوجائے نہ یہ کہ اعلیٰ مقصد کی خاطر جان دے دی جائے ۔"

اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں :-

"اس خط میں عام کانگریسیوں کی ذہنیت کا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے ۔" (آئی ۔ آئی ۔ بجم ۱۴)

یہ ہے وہ عدم تشدد جسے برسوں سے ہمارے مسلمان قومیت پرست اور علماء حضرات اپنا عقیدہ (Creed) بنائے ہوئے تھے ۔

⁂

آفتاب تازہ... انگریز اور ہندو دونوں کے راستہ میں مسٹر جناح کا وجود ایک بہت بڑی چٹان ہے جو ان کے مقاصد کے بروئے کار آنے میں ہر موقعہ پر حائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی انتہائی خواہش ہے کہ کسی طرح راستہ کے اس کانٹے کو الگ کر دیا جائے۔ اس کے لئے سب سے آسان اور بظاہر مؤثر حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ خود مسلمانوں میں سے کسی قابلِ اعتماد مُہرہ کو آگے بڑھایا جائے۔ مسلمانوں میں ایسے مُہروں کی کمی بھی نہیں۔ جو قوم قعرِ مذلت میں گر چکی ہو اس میں جاہ پرست ملت فروشوں کی کیا کمی ہو سکتی ہے! چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچھلے دنوں سے ہندو اور اینگلو انڈین پریس۔ سر سکندر حیات خان کو آسمان پر چڑھا رہے ہیں کہ مسلمانوں میں سیاست و تدبر صرف سر سکندر کا حصہ ہے۔ ہندو مہاسبھا کے صدر۔ مسٹر ساور کر مسئلۂ خاکساران پر انھیں مبارکباد کے تار بھیجتے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز بجم ۱۹) اسٹیٹسمین کے افتتاحیہ مقالوں کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ "یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب دیکھا ہے۔" (اسٹیٹسمین بجم ۱۲) اس کے برعکس ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ مسٹر جناح کو اس کے مقام بلند سے گرا دیا جائے۔ مسلمان قوم کو مبارک ہو کہ بالآخر ان کے بہی خواہان (ہندو اور انگریز) نے ان کے لئے ایک حقیقی راہ نما تلاش کر دیا جس کی قیادت میں ان کا منزل مقصود تک پہنچنا یقینی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ منزل بھی خود ہندو اور انگریز ہی کی متعین کردہ ہو۔ اسے بخت سوختہ قوم خوش ہو جا کہ ۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا ... آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

بہرحال تیرے غمخواروں نے تیرے لئے ایک حقیقی نجات دہندہ تلاش کر دیا ہے۔ اب تیرا مقدر ہے کہ تو اسے قبول کر لے یا ٹھکرا دے۔ دیکھ کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے بھی بعد میں یہ "الہامی آواز" سننی پڑے کہ

"دنیا میں ایک نایاب گوہر آیا۔ پر دنیا نے اس کی قدر نہ کی۔ لیکن اس کا "خدا" اُس کی قدر کرے گا اور آئندہ الیکشن میں اگر وہ منتخب نہ ہو سکا تو اسے خصوصی اختیارات سے نامزد کر کے اعتمادِ عام کا سارٹیفکٹ عطا کر دے گا۔"

راج کرے گا خالصہ گزشتہ جون میں لاہور میں "آل انڈیا سکھ کانفرنس" کے اجلاس کی تقریب پر مسٹر ساورکر، صدر آل انڈیا ہندو مہاسبھا نے ایک پیغام بھیجا جس کے دوران میں آپ فرماتے ہیں :۔

" سب سے پہلے اور سب سے ضروری یہ امر ہے کہ ایک سکھ قومی فوج مرتب کرنا شروع کردی جائے۔ یعنی سکھ رضا کاروں کی فوج ۔ ساز و سامان سے آراستہ۔ سپاہیانہ قواعد سیکھی ہوئی جو مفسد خاکساروں اور افعی خدائی خدمتگاروں سے کم از کم تین گنا قوت رکھتی ہو ۔ اپنی تمام قوتوں کو اسی ایک نقطہ پر مرکوز کردو ۔ شروع میں دو تین سال تک سکھ رضا کاروں کی جماعت رہے ۔ اور اس کے بعد اس میں ایسی صلاحیت پیدا کرلی جائے کہ اگر کبھی پاکستان ایک حقیقت بن کر سامنے آرہا ہو تو یہی جماعت سکھوں کی ایک مستقل فوج میں تبدیل کرائی جا سکے ۔"

(ایسٹرن ٹائمز ۸ جون)

چنانچہ اس کے بعد ایسٹرن ٹائمز میں تحریر ہے کہ سکھوں نے پنجاب کو بارہ حصوں میں تقسیم کرلیا ہے ۔ اور ایک نیم عسکری سکھوں کی فوج (اکالی سینا) قائم کرلی ہے ۔ اور وہ مختلف شہروں میں ہتھیار بند فوجی پریڈ کرتے پھر رہے ہیں ۔ اور ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا !

ناواقف کو اس پر شاید کچھ تعجب ہو ۔ لیکن جو حقیقت حال سے واقف ہیں ۔ انھیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہو سکتا ۔ پنجاب میں آج بھی عملاً سکھوں کا راج قائم ہے ۔ مسلمان ارباب حکومت کو ساری فکر اپنی وزارت کی بقا کی ہے اور اس کا راز سکھوں کی حمایت میں مضمر ہے ۔ سکھ اس حمایت کی قیمت یوں وصول کر رہے ہیں کہ خاکساروں کو کچل کر رکھ دیا جائے ۔ اور سکھوں کو عسکری جماعتوں میں منتقل کر دیا جائے ۔ سکھوں کا قومی گیت یہ ہے کہ :۔

" راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کو "

(حکومت سکھوں کی ہوگی جس میں کوئی نافرمانبردار باقی نہ رہے گا)

اپنی باری جب حکومت پنجاب نے خاکساروں کے خلاف ۔ یہ الزام عاید کیا ہے کہ وہ ہندوستان

میں "پانچواں کالم" ہیں اور ان کا استیصال ضروری ہے تو عام ہند و اخبارات یک زبان بول اُٹھے کہ بالکل بجا فرمایا - یہ ہیں ہی ایسے - انھیں ضرور حوالہ دار ورسن کر دینا چاہئے کسی نے تنا نہ کہا کہ صاحب! یہ الزام بہت بڑا ہے - اس کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش کیجئے -

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پنجاب گورنمنٹ نے کچھ سکھ ایم - ایل - اے اس الزام میں گرفتار کر لئے کہ ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے ہے - اس مرتبہ ملزم چونکہ غیر مسلم ہیں - اس لئے وہی اخبارات چلا رہے ہیں کہ حکومت پنجاب اگر ان کے خلاف یہ الزام عائد کرتی ہے تو اس الزام کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی تو پیش کرے - یوں ہی بلا ثبوت و دلیل لوگوں کو گرفتار کر لینا کہاں کا انصاف ہے !

دیکھا ! جب گھر کو لگی تو انصاف یاد آ گیا !

اور حکومت پنجاب کی تو دیہ حالت ہے کہ قریب پچیس ہزار روپے کے صرفہ سے اسمبلی کا ایک دن کا خفیہ اجلاس منعقد کیا - اور اس میں غالباً وہ وجوہات بیان کیں جن کی بنا پر یہ گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں اور بچارے خاکساروں کی یہ حالت کہ خود حکومت کی متعین کردہ "ینگ کمیٹی" کی رپورٹ تک شائع نہیں کی گئی -

اطاعتِ امیر (از مبصرؔ)

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا خوارند و زارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے نہ دارند

بابِ اوّل ~~~~ (افتتاحی اشارات)

(۱) **قانونِ فطرت**

خورشید جہاں تاب طلوع ہوتا ہے۔ اپنے جلو میں نور و حرارت۔ زندگی اور تازگی کا جاں نواز ہنگامہ لئے ذرّے ذرّے کو جگاتا قطرے قطرے کو گرماتا نصف النہار تک پہنچتا ہے۔ یہاں سے ڈھلنا شروع ہوتا ہے۔ ڈھلتے ڈھلتے سرِ شام اپنی منزل پر پہنچتا ہے اور شفق کی ردائے احمریں اوڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دن کی روشنی شام کے جھٹپٹے میں اور جھٹپٹا تاریکی میں بدلتا جاتا ہے۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ جاتے ہیں۔ رات کی خاموش ظلمتیں چھا جاتی ہیں۔ ہر چیز کو گویا نیند سی آجاتی ہے۔ ہر روز اور ہر وقت کسی نہ کسی نقطۂ ارض پر یہی ہوتا رہتا ہے۔ تخلیقِ روزگار کی صبحِ اوّلین سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور شامِ ابد کی آخری حدود تک یہی ہوتا رہیگا۔

ایک سورج پر ہی کیا موقوف ہے۔ جیسے جیسے نظامِ قدرت پر غور و فکر کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا یہ حقیقت واضح سے واضح تر ہوتی .... جائے گی کہ کارگہِ ہستی کی کوئی شے ایسی نہیں جو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر رہی۔ ثوابت و سیارے

آبشار و کوہسار دشت و در۔ بحر و بر۔ ہوا و فضا۔ کڑکتی بجلیاں۔ گرجتے بادل۔ چرند۔ پرند غرضیکہ کوئی ممکن الخیال مشہود اور غیر مشہود چیز ایسی نہیں جو ایک عالمگیر ضابطہ عمل سے الگ پڑی ہے۔ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ہر شئے اپنی اپنی متعین حدود میں باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ ہر چیز ایک آئین محکم کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ یہی وہ عالمگیر ضابطہ ہے جسے زیادہ تر مروج زبان میں قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ اسی قانون کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ اس میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ نہیں ہوتی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ سورج مشرق کو چھوڑ کر مغرب سے طلوع ہو۔ دریا نشیب سے مڑکر فراز کی طرف بہے۔ اچھالا ہوا پتھر قانونِ کشش زمین (Law of Gravitation) کے خلاف گرنے کی بجائے معلق رہے یا شعلہ جلانے کی بجائے برف کا کام دے۔ یہ سب کچھ اس لئے اس طور پر ہے کہ "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" ؎

اللہ کے قانون میں ہوتی نہیں ترمیم!

.... قانون ہوتا ہی اس لئے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ ہر قانون کی یہی شان ہے۔ قانونِ فطرت کی برتری اس میں ہے کہ اس کی مخالفت ناممکن ہے۔ لَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اللہ کی مکمل اطاعت پر عمل پیرا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز خواہی نخواہی اس کے آگے جھکی ہوئی ہے۔)

موجودات کی یہ آئین پسندی فطرت کے اعمال (Pro cesses) میں یہ باقاعدگی۔ عناصر میں یہ ہم آہنگی (Harmony) یہ اہتمام اور اس اہتمام میں یہ استمرار و دوام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ پس پردہ کسی علیم و حکیم صناع (Architectonic Intelligence) کا دستِ قدرت ہے جو کائنات کی اس عظیم الشان مشینری کے ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے پرزے کو حرکت دے رہا ہے۔ چونکہ ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ فطرت کا ہر عمل کوئی خاص نتیجہ لئے ہوئے ہوتا ہے لہٰذا کائنات کی حرکتِ کلّی بھی ضرور کوئی مقصد اور نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ہے بیکار نہیں

حکمتِ جدیدہ ہزار فیصلہ کرے کہ یہ جو کچھ ہے فطرت کی طاقتوں کا لایعنی کھیل (Play of blind Forces of Nature) ہے مگر وہ شیٔ لطیف جو انسان کو انعامِ خاص کے طور پر ودیعت ہوئی ہے اور وہ ضمیر جس کا پیوند عالمِ لاہوت سے ہے نہ صرف یہ کہ اس فیصلہ پر مطمئن نہیں بلکہ اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ عصرِ رواں کے مادی فلسفہ اور سائنس کی ہزار در ہزار الجھنوں اور تاریک حجابوں کو چاک کرکے یہ درخشندہ اور تابناک حقیقت خود بخود نگہِ انسانی کے سامنے آجاتی ہے کہ صانعِ ازل کی یہ عظیم الشان صناعی بیکار نہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ؕ کائنات کی یہی بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم میں بار بار اور مختلف پیرایوں میں توجہ دلائی گئی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ $\frac{3}{190}$	"تحقیق کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں۔ رات اور دن کے اختلاف میں ارباب دانش کے لئے کھلی کھلی نشانیاں ہیں"

دوسری جگہ فرمایا گیا

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی اللَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ؕ	"کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ رات کو دن میں چھپاتا ہے اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑا جا رہا ہے اور تم (بھی) جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔"

یہ اور اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں مختلف نظائر و بصائر سے سمجھایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مقصد خاص کے لئے کام کر رہی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق و تحریک بھی کسی مقصد کے لئے ہے۔ سارا عالم اسی مقصد کی طرف مصروفِ خرام ہے۔ جب حقیقت یہی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ انسان جس کے لئے ساری کائنات وجود میں آئی ہے بے مقصد و مدعا پیدا کر دیا گیا ہو جب ایک حقیر ذرہ اور بے مایہ قطرہ بھی باطل یعنی بے کار نہیں تو یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ انسان جس کے سر پہ تاجِ تکریم رکھا گیا اور جس کو جبر و بے پر اختیار دیا گیا (قرآن مجید $\frac{2}{2}$) جس کو فرشتوں سے بھی زیادہ

صلاحیتیں دی گئیں (۲۳ ط) کسی مقصد کا پابند نہ ہو؟ صحیفۂ فطرت کا ورق ورق اسی لئے انسان کے سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے کہ وہ عقلِ خداداد سے کام لے کر ایک نتیجا اخذ کرسکے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے فلسفہ صدیوں سر ٹپکتا رہا۔ مگر سوال جوں کا توں رہا ؎

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

(۲) **خلافتِ الٰہی** | جہاں علم و حکمت بے بس ہو کر سپر ڈال دیتے ہیں وہاں **وحی و الہام** بطور ایک لطیفۂ غیبی اور فضلِ ربّانی کے عین مجبوری اور درماندگی میں انسان کی دستگیری کرکے اُسے اس راہ پر ڈالتے ہیں جس پر چل کر اس کو اپنی منزلِ مقصود کا نشان صاف نظر آنے لگتا ہے۔ گمانوں کے لشکر یقین کے ثبات سے شکست کھا جاتے ہیں۔

مذہب ایک سچا اور الہامی مذہب ہی ہے جو انسان کو ایک بلند اور شریفانہ نصب العین دے کر پستی میں گرنے سے روکتا ہے۔ صرف الٰہی لطف و کرم کی تجلّی ہے جو نگاہ کو زندانِ آب و گِل سے رہا کرکے ثریّا تک پہنچاتی ہے۔ مشاہدہ اور مشاہدات پر مبنی علوم کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اس محدود دائرے میں بے شمار پہنائیاں شرمندۂ خبر و نظر نہیں ہو سکیں۔ بتصرفِ قلیل ؎

در جہانِ کیف و کم گردید عقل — پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست؟ — کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست؟

عقلِ بیچاری تو آج تک یہی طے نہ کرسکی کہ روح ہے یا نہیں۔ مادّہ حقیقت ہے یا سراب۔ روح مادّہ سے ہے یا مادّہ روح سے وغیرہ وغیرہ۔ باقی باتیں تو بہت اونچی ہیں۔ یہ صرف **خطابِ الٰہی** ہے جو حقیقت کی تجلّیوں کو نگہِ انسانی پر بے حجاب کرتا ہے۔ یہ وحیِ آسمانی ہے جس نے اعلان کیا کہ انسان کائنات کی ہر چیز سے بلند و برتر ہے۔ سورج۔ چاند ستارے۔ صحرا دریا ہر شئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق چیز انسان کے لئے ہے۔ مگر وہ خود صرف خدا کے لئے ہے۔ انسان خدا کے بعد سب سے بڑی قوّت ہے۔ انسان اگر اپنے مرتبہ اور عظمت کے لحاظ سے سر جھکا سکتا ہے تو صرف خالقِ کائنات کے آگے۔ جو انسان اس کے علاوہ اپنے برابر یا کمتر قوّت کے

آگے جھکتا ہے وہ انسانیت کے درجے سے گر کر صرف ایک چیز (A thing) رہجاتا ہے۔ اور چونکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ مفوضہ فرائض کی تعمیل کر کے اپنی صحیح شان برقرار رکھ رہی ہے۔ جب انسان اپنے مرتبہ سے گر جاتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں (Mere Nothing) رہجاتا ہے۔ احسن التقویم ہو کر جب وہ اپنے مقام سے رڑھکتا ہے تو بغیر کسی درمیانی درجہ میں ٹھہرے ہوئے اسفل السافلین کے ظلمتناک گڑھے میں جا پہنچتا ہے! انسانیت کی حدود سے خارج ہو کر حیوانات نباتات اور جمادات سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

انسان اور دیگر حیوانوں میں حیوانیت مشترک ہے۔ اس کا شرفِ خصوصی اور امتیاز (Differentia) وہ عقل اور بصیرت ہے جو اس کو ہر چیز سے بلند لے جاتی ہے۔ اتنا بلند کہ مہر و ماہ و مشتری کو بھی ہم عنان سمجھنا اس کے لئے ننگ و عار ہو جاتا ہے۔ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ انسان خدا کے آگے جھک کر کائنات کو اپنے آگے جھکا ئے رکھے۔ خدا کے آگے جھکنا اور کائنات کو جھکا ئے رکھنا یہی دو پہلو ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتے ہیں۔ صرف ایک خدا کی بندگی اور روئے زمین کی حکومت دونوں چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ کسی اور طرح سوچنا اپنے تفضّل، اپنی خودی اور اپنی عظمت کو خاک میں ملانا ہے۔ یہی چیز کفر ہے۔ اسی کا نام معصیت ہے۔ اور اسی کو غلامی کہتے ہیں! ایک خدا کی بندگی کا دعویٰ اور محکومی۔ کئی خداؤں کی پوجا اور آزادی ضدین ہیں جن کو آپس میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اللہ کے آگے جھکنے والا ہی آزاد ہے اور آزاد ہی ایک اللہ کے آگے جھک سکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل: ؎

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

مختصراً یوں سمجھئے کہ جو ایک خدا کی خدائی پر ایمان لائے گا وہ صرف اسی کے قانون کو واجب الاطاعت سمجھ کر اسی کے قانون کو اپنی زندگی اور اپنے ماحول کی حیات میں جاری و ساری کرنے کی سعی کریگا۔ اور چونکہ اس قانون کی مخالفت ناممکن ہے اس قانون کو نافذ کرنے والے کا عزم و تہوّر بھی بے پناہ ہو جائے گا جب وہ دساتیر جہاں پر اللہ کی حکومت قائم کرے گا تو خدا کا دُوسرا ئے بھی وہی نامزد ہوگا۔ کائنات کی ساری

قوتیں اسی لئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری پر مامور و مجبور کر دی گئی ہیں کہ وہ وسعتِ شش جہات میں خدا کی نیابت کر کے جہانِ نا تمام کی تکمیل کر سکے خلافتِ الٰہی کا قیام ہی انسان کی منزل ہے۔ اس منزل کا نشان مذہب نے ہی بتایا۔ یہی منزل ہے جس کی طرف پُرخلوص قدم اٹھا کر یہ اپنے اندر ملکوتی جوہر پیدا کرتا ہے، وہ جوہر جن کے طفیل یہ خدا کا شاہکار ہے۔

(۳) ضرورتِ وحی

بہر حال اور بایں ہمہ عظمتِ شان، انسان حیوان ناطق ہے۔ حیوانیت اس کی انسانیت سے الگ کر دی جائے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ لیکن اگر یہی حیوانیت اپنی حدود سے بڑھ کر انسانیت پر قابو پالے تو نتیجہ درندگی، بہیمیت اور سفلہ پن ہوتا ہے۔ انسان اپنی صحیح راہ سے بھٹک جاتا اور اصل مقام سے گر جاتا ہے۔ یہ وحی کا ہی پرتو ہے جو انسانی جوہر کی تربیت کر کے حیوانیت کو اس کی جائز حدود میں رکھتا ہے۔ جب انسان اس پرتو سے منور ہو جاتا ہے تو یہ پیکرِ خاکی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اگر فرشتے بھی اس کو سجدہ نہ کریں تو ابدالآباد تک راندۂ درگاہ اور مردود قرار پائیں!

مذہب اور وحی کا مشن صرف افراد کی صلاحیتوں کی تعمیر و تربیت اور تزکیۂ نفس ضرور ہے مگر اس سے بھی بلند اور بالاتر ایک اور مدعا ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی ایک واضح لائحۂ عمل اور ایک خاص پروگرام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کو قیامِ خلافتِ الٰہی ایسا گراں بار فرض تفویض کر دیا گیا ہو اور اس کو بجالانے کا طریقہ نہ بتایا گیا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ظلوم اور جہول انسان کے کاندھوں پر اتنا بڑا بوجھ رکھ دیا گیا ہو اور اس کو اٹھا کر چلنے کا گُر نہ سمجھایا گیا ہو۔ یہ محال عقلی ہے کہ اس بارِ عظیم کے حامل کی راہ نما کوئی آواز نہ ہو۔ یہ آواز "الہام" ہے جو کاروانِ آدم کے لئے بانگِ درا کا حکم رکھتی ہے۔ راہروِ جادۂ ہستی کے لئے ضروری تھا کہ سفر کا پہلا قدم اُٹھتے ہی منزل کا پتہ دینے والی تجلی بھی ساتھ ساتھ رہے۔

وَاِنْ مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ...... ایسا کوئی قریہ نہیں جس میں ہم نے ڈرانے والا نہیں بھیجا۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ .... ہر قوم کی طرف کوئی نہ کوئی ہادی بھیجا گیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا ..... یقیناً ہم نے اپنے کھلی کھلی ہدایات دیکر بھیجا اور

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۵۷/۲۵ — اور اُن کے ساتھ کتاب (خلافتِ الٰہی کے قیام کے لئے ضابطۂ قوانین) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ نوعِ انسانی عدل و توسط کی راہ پر چل کر (منزلِ مقصود تک پہنچ سکے)

(۴) ختمِ نبوت

غرضیکہ نمودِ آدم سے لے کر طلوعِ اسلام تک ہر دور اور زمانے میں ہر قوم کے لئے رہنما آتے رہے اور انسانی قافلے کے مختلف دستوں کو راہ دکھاتے رہے۔ اس عالمگیر کارواں کے مختلف گروہ خدا کی وسیع زمین کے مختلف اقطاع سے اُٹھے مگر بالآخر وہ ایک عظیم الشان شاہ راہ پر ملنے والے تھے جہاں سے سب شانہ بشانہ چلیں اور جہاں سے منزلِ مقصود صاف اور سامنے نظر آئے۔ ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کے رہبروں کا کام صرف اتنا تھا کہ اپنے اپنے گروہ کو ایک "جرنیلی سڑک" پر پہنچا دیں۔ جہاں پہنچکر سب کی راہ ایک ہو جائے۔ سب کی منزل ایک ہو جائے۔ قافلہ سالار ایک ہو جاتے۔ چنانچہ جہاں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں آکر ملتی ہیں۔ اور جہاں بھٹک کر پراگندہ راہوں میں کھو جانے اور منزل سے دور جا پڑنے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ ایک سالارِ اعظم آتا ہے اور درماندہ راہ رووں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں تم سب کی رہنمائی کے لئے آگیا ہوں۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعاً ؏

تمہارے لئے ساری راہیں جو خطرات سے پُر اور منزل سے دور لے جانے والی ہیں بند کر کے صرف ایک ہی راہ کھُلی رکھی گئی ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ جو اِدھر اُدھر بھٹکتا رہیگا منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچ سکیگا وَمَنْ يَّبْتَغِ غیر الاسلام دینًا فلن يُّقْبَلَ منه۔ پھر اہلِ کارواں کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا گیا کہ تمام راستوں کی جانچ پڑتال کے بعد یہی راستہ آخری اور قطعی طور پر مقرر کر دیا گیا ہے اسی میں اطمینان و آرام ہے۔ یہی منزلِ مقصود تک ٹھیک لے جانے والا ہے۔ تمہارے لئے اسی کو پسند کیا گیا ہے :-

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناہ — آج کے روز تمہارے لئے دین مکمل کر دیا گیا۔ تم پر نعمت تمام کر دی گئی اور تمہارے لئے اسلام بطور ایک ضابطۂ حیات کے چُن لیا گیا۔

(۵) ایک انقلاب

انبیاء و رُسل کی تعلیم و تربیت کے بعد جب انسان اپنی منزل کے اس مقام پر پہنچا

تو اس کا عہدِ طفولیت ختم ہوا۔ اور شباب آیا۔ شباب کیا انقلاب آیا۔ مشرق و مغرب کا وہ سب سے بڑا انقلاب جسکو بروئے کار لانے کے لیئے زمین و آسمان چکر میں تھے۔ انقلاب آیا اور اس شان سے کہ اس خدائی سیلاب کے تند و تیز ریلے میں ہر غیر الٰہی قوت خس و خاشاک کی طرح بہ گئی۔ نسل و وطن کے بُت پاش پاش ہو گئے۔ بلند و پست کی تخصیص مٹ گئی۔ محمود و ایاز ایک ہو گئے۔ بندہ و بندہ نواز ہم شیر و شکر ہو گئے۔ اسود و احمر کا امتیاز یک قلم اٹھ گیا۔ قیصری و سکندری کے پُر غرور سر جھک گئے اور ان سروں کو زینت دینے والے تاج و کُلاہ، اونٹ چرانے والوں کے قدموں میں آ گرے۔ کفر و شرک۔ زنا۔ چوری۔ قتل۔ ڈاکہ۔ لوٹ مار۔ سلب و نہب۔ فسق و فجور اور نا خدا ترسی کا رنگ ضمیرِ کائنات سے اڑ گیا۔ رہبانیت اور برہمنیت کی ظلمت انگیز گمراہیاں فاران کی تجلیوں سے کافور ہو گئیں قلوب کچھ اس طرح صیقل ہوئے کہ ابدی و ازلی حقیقتیں ان میں جھلکنے لگیں۔ سارے امتیاز مٹ کر صرف ایک امتیازِ کفر و ایمان باقی رہ گیا۔ بزرگی اور نیکی کا معیار صرف خدا ٹھہرا۔ مشرق و مغرب میں اللہ کا نام گونجنے لگا۔ لمن الملک الیوم؟ للہ الواحد القھار! کا سماں پیدا ہو گیا۔ اور وہ فرشتے بھی جنھوں نے حضورِ یزداں میں انی جاعل فی الارض خلیفہ سن کر اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء کہنے کی جسارت کی تھی انی اعلم ما لا تعلمون کے اسرار و رموز بے حجاب دیکھکر سر بگریباں رہ گئے۔

(۶) اس انقلاب کی نوعیت

انقلاباتِ عالم کی تاریخ پر ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈالیئے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ ہر انقلاب کی تہ میں ایک خاص نظریۂ حیات (View Point of Life) اور ایک خاص تصورِ کائنات (World Picture) تھا جو اس کو رونما کرنے کا باعث ہوا۔ پھر ایک دوسری طرح ان انقلابات پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام رہے۔ بعض فکر و عمل کے بحرِ ناپیداکنار میں ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا نہ کر سکے۔ اور بعض نے وہ طوفانی ہنگامے پیدا کیئے کہ آج تک ہر موج محشر بداماں ہے۔ انقلاب کی اثر اندازی کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ تغیر و تبدل کی گیرائی اور رسائی کہاں تک ہے۔ یہ سب کچھ اس نظریہ پر موقوف ہے جو انقلاب کی روح کے طور پر کام کرتا ہے۔ پھر نظریہ کی بلندی یا پستی بھی اپنی جگہ پر انقلاب پیدا کرنے والے بلند یا پست شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اکثر انقلابات ایسے تھے جو صرف خیالات میں ایک

خفیف سا تموج پیدا کر کے رہ گئے۔ ذہنیتوں اور سیرتوں پر موت اور زندگی پر کوئی نقش نہ چھوڑ سکے۔
اور چند انقلابات ایسے بھی ہیں جن کی آمد سے کائنات پگھلی ہوئی موم کی طرح ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی
اسلام جو مشرق و مغرب کا سب سے بڑا انقلاب ہے، اس ثانی الذکر نوعیت کا انقلاب ہے۔ یہ
مکمل ترین اور عظیم ترین انقلاب یا اعجاز ہے۔ دُنیا کے مکمل ترین اور عظیم ترین انسان کی مختصر سی زندگی کا۔
اسلام نے نہ صرف یہ کہ نظریۂ حیات کو بدل دیا۔ بلکہ ایک بالکل اچھوتا اور جدید تصورِ کائنات پیش کیا۔
جس سے فکر و عمل۔ جذبات و حسیات۔ آرزوؤں اور امنگوں کی دنیا ہی دگرگوں ہوگئی۔ دو لفظوں میں
محمد عربیؐ نے عالم انسانی کو **ایک اجتماعی اور ہمہ گیر ضمیر بخشا** وہ ضمیر جس میں یزداں کی مشیت جھلک سکے۔
اور انقلابات کی طرح اسلام بھی ایک پیغام لایا۔ اور وہ پیام ہے لآ الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ
موسیٰ اور عیسیٰ بھی یہی پیغام لائے اور انبیائے سابق بھی۔ لیکن جو بات لآ الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ
میں ہے وہ لآ الٰہ الاّ اللہ موسیٰ کلیم اللہ میں ہے نہ لا الٰہ الاّ اللہ عیسیٰ روح اللہ میں
اس لئے کہ موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ کا مشن ساری دنیا کے لئے نہیں تھا اور نہ ہی یہ اُن کا دعویٰ
تھا۔ اُن کا خطاب محدود تھا۔ لآ الٰہ الاّ اللہ کا جلال و جمال موسیٰ و عیسیٰ کے ہاں بھی وہی تھا جو محمد
(فداہ ابی و اُمّی) کے یہاں ہے۔ مگر لا الٰہ الاّ اللہ کی پوری اور عالمگیر تجلی پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ
نے فاران سے بے حجاب کی ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی!

غارِ حرا سے اُتر کر آنے والا رسولِ کائنات جو نسخۂ کیمیا اپنے ساتھ لایا وہ صرف قریش یا عرب کے لئے
نہیں تھا۔ بلکہ مشرق و مغرب کی اُمتوں اور پوری کائنات کے لئے ہے۔ رسولِ عربی کا نظریہ توحید صرف
اعتقادی ٹوٹکا ہی نہیں۔ بلکہ موجودات کی ہر شئے کا یہی اصولِ حیات ہے۔ بخوفِ طوالت مختصراً یوں سمجھنا
چاہیئے کہ اسلام نے جو انقلاب رونما کیا وہ ہے انقلابِ توحید۔ خدا کے آخری پیغام نے ایک خدا کا
تصور پہلی مرتبہ کائنات گیر طور پہ پیش کیا۔ یہ توحید صرف خیالی اور اعتقادی توحید نہیں۔ اس توحید کا

مقصدِ عملی زندگی کی مکمل توحید ہے۔ انسانی گروہوں کی توحید ہے۔ ان گروہوں کی راہِ سفر اور منزل کی توحید ہے۔ یہ سارا "ایکا" اس لیے ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور اسی کی طرف ساری کائنات کو جانا چاہیے والی اللہ ترجع الامور۔

(۷) ختمِ نبوّت کی حکمت

خاتم النبیین کے ذریعے خدا نے اپنا آخری پیغام اس لئے بھیجا کہ جس عظیم الشان مقصد کے لئے آدم کی تخلیق ہوئی تھی اور جس کے پیش نظر ہزاروں برس تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس کی الہامی تربیت کرتے رہے وہ آخری اور مکمل طور پر انسانوں پر واضح کر دیا جائے محمدؐ عربی کے ہاتھوں دین کی تکمیل کے معنی ہی یہ ہیں کہ صدیوں کی نسلی ۔ وطنی اور فرقہ وار تعلیم و تربیت کے بعد تمام نوع انسان کو بلا امتیاز نسل و رنگ اس منزل کا پتہ دیا جائے جو سب کی مشترک منزل ہے۔ اتمامِ نعمت یہی ہے۔ نوع انسانی اسکے بعد نئے نئے رسولوں اور نئی نئی شریعتوں کی آمد سے فرقوں اور گروہوں میں نہ بٹی رہے بلکہ متحد ہو کر ایک عالمگیر برادری بن جائے رب العٰلمین کے بھیجے ہوئے رحمۃ للعٰلمین رسول نے اسی لئے اِنّی رسول اللہ الیکم جمیعا فرمایا۔ اس رسول کی اُمت اسی لئے خیر اُمّۃ ہے کہ وہ صرف ایک ہی رنگ صبغۃ اللّٰہی میں رنگی ہوئی ہے اور اسی میں سب کو رنگ دینا چاہتی ہے ؎

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است — وحدتِ مُسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم!
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ما کہ یک جانیم از احسانِ اوست
تا ازیں وحدت ز دستِ ما نرود! — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود!
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را — او رُسل را ختم ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخری جامے کہ داشت
لا نبی بعدی ز احسانِ خداست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰےؐ است (اقبالؒ)

(۴) اخوت و اجتماعیت

وحی والہام کا سلسلہ خلافتِ الٰہی کو قائم کرنے والے سپاہی تیار کرنے کے لئے تھا۔ انفرادی اور قومی تربیت کے بعد جو شئی سب سے زیادہ اہم تھی وہ تمام انسانوں کی مرکزی اور اجتماعی تربیت تھی یا بالفاظ دیگر سب جماعتوں کو توڑ کر صرف ایک ہی جماعت تیار کرنا تھا جس میں ساری خوبیاں جمع ہوں۔ خدا کا آخری مذہب آیا ہی اس لئے تھا کہ انسان کو بے شمار خداؤں سے نجات دلا کر ایک خدا کے سامنے جھکا کر سر بلند کرے۔ توحید کی روح پھونکنے کے بعد اُس روح کے جو مظاہر مقرر فرمائے گئے اُن میں بھی اس اجتماعیت کو بروئے کار لانے کی قوت پنہاں رکھی گئی مثلاً:

کلمہ — بنی نوعِ انسان کے لئے ایک ہی (Moto) کلمہ مقرر کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ توحید کی روح جن پاک اور بلند جذبات کو پیدا کرے اُس کے اظہار کا طریق بھی ایک ہی ہو۔ دلوں سے ایک ہی صدا نکلے۔ کانوں تک ایک ہی آواز پہنچے اور سب کو ایک ہی زندگی بخش تاثیر سے ہمکنار و درآغوش کرے۔ یہ کلمہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ اس میں سب سے پہلے تمام مصنوعی اور خود ساختہ خداؤں کے خلاف ایک عام اور بے پناہ بغاوت کا اعلان ہے۔ جب انسان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے تو اس کا عقیدت ہر فرعونِ بے سامان کے آگے سے بے خوف و خطر اٹھ جاتا ہے اور اِلَّا اللّٰہُ کہنے کے بعد صرف ایک اور ایک ہی حقیقی اور ہمہ گیر قوت کے آگے جھک جاتا ہے۔ جس کی توفیق سے تمام قوتوں سے بغاوت اور تمام زنجیروں سے رہائی کی نعمت نصیب ہوئی۔ محمد رسول اللہ کہکر انسان دنیا کے اس سب سے بڑے انسان، اس سب سے بڑے محسن کا شکریہ ادا کرتا ہے جس کی رہنمائی کے طفیل یہ سب کچھ حاصل ہوا۔ محمد کی ذاتِ گرامی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والوں کے لئے **شیرازہ بند قوت** کا کام کرتی ہے۔ لَا تمام زنجیریں کاٹ دیتا ہے اور اِلَّا زندگی کو اساس محکم عطا کرتا ہے۔ یہی نفی و اثبات ہے جس میں ہر قوتِ باطل کی شکست و ریخت اور ہر سچائی کی تثبیت و فروغ کا راز مضمر ہے۔ انہی دو حقیقتوں کو سمجھنے سے اُمتیں زندہ ہوتی ہیں اور انھیں کو نہ سمجھنے سے قومیں مرتی ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال — اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات — لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون ۔۔۔ حرکت از لا آید از اِلّا سکون
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست ۔۔۔ ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
ملتے کز سوزِ او یک دم تپید ۔۔۔ از گلِ خود خویش را باز آفرید
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات ۔۔۔ تازہ از ہنگامۂ او کائنات

لا و اِلّا ساز و برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

نماز ـــــ کو بہترین عبادت کہا گیا ہے ۔ اس میں تمام وہ صفات یکجا جمع ہیں جو پیغامِ محمدی اپنے مخاطبوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ سب سے پہلی چیز تو وہی توحید ہے جس کا ذکر چند لفظوں میں اوپر کر دیا گیا ہے ۔ نماز اس امر کا عملی ثبوت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد و رسوم کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی پوری زندگی بلکہ حیات بعد الممات پر بھی پوری طرح حاوی ہے وہ مذہب' مذہب ہی نہیں جو سفرِ حیات کی ہر کٹھن منزل میں انسان کی رہنمائی نہ کر سکے ۔ وہ "دین" ٹھکرا دینے کے قابل ہے جو حیاتِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کے چند تاریک اور غیر اہم حصوں میں اپنی پناہ گاہ تلاش کر لے اور باقی ساری زندگی کو بے مہار چھوڑ دے ۔ اسلام کی امتیازی خصوصیت یہی ہے وہ تمام زندگی کو ایک مستقل اور اٹل سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے ۔ اس میں جتنی چیزیں "مذہبی" ہیں وہ بھی عملی زندگی کی تربیت و تشکیل کے لئے ہیں ۔ نماز اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ایک خاص طریق عبادت ہے دوسرے مذہب کے تماشائیوں کے لئے اور بدقسمتی سے آج خود مسلمانوں کی غالب اکثریت کے لئے یہ ایک "ایسی جیری اٹھک بیٹھک" (معاذ اللہ) سے زیادہ کچھ نہیں جس سے خدا اور رسول خوش ہوتے ہیں" لیکن آہ ۔ ہم نہیں غور کرتے کہ نماز اس سے ورا الورا بھی بہت کچھ ہے ۔ قرآن نے کئی سو جگہ نماز قائم کرنے کی شدید تاکید کی ہے ۔ رسول اکرمؐ نے اس کو معراج المومنین فرمایا ہے ۔ اس تاکید و ترغیب کا مقصود بھی وہ مبنی بر توحید اجتماعیت، اخوت اور مساوات قائم کرنا تھا جس کے بغیر اللہ کی خلافت قائم نہیں ہو سکتی ۔ امیر و غریب' شاہ و گدا ۔ عارف و عامی ۔ بلند و پست، گورے کالے ۔ ایک ہی صف ۔ ایک ہی امیر (امام)

امیر کی ایک ہی آواز پر ایک ساتھ بلا چون وچرا اُٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ نماز کے فلسفہ پر غور کیجئے تو نگاہِ بصیرت کے سامنے ایک دل افروز اور حیات انگیز دلبستان کھل جاتا ہے۔ ایک عظیم الشان راز سے پردہ سرک جاتا ہے۔ اللہ کے سپاہیوں کی جماعت صف بستہ ہوکر حرکات وسکنات۔ اعضاء وجوارح۔ دل اور دماغ۔ سکوت وکلام۔ قعود وقیام اور ہر ممکن طریق سے اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آذری!

دن میں پانچ بار بلا ناغہ بچے۔ بوڑھے۔ مرد وزن اللہ کی توحید کی گواہی دیکر اس کا عہد کرتے ہیں کہ اللہ تو ہی حقیقی بادشاہ ہے۔ اس طرح اللہ والوں کی عالم آرا۔ بے پناہ اور بلند جماعت اپنی تربیت کرتی ہے تاکہ اپنے اسی ساز وسامان کے طفیل وہ مشارق ومغارب پر چھا جائے ؎

جو فلسفیوں سے کھُل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اِک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

رُوزہ ــــ روزہ سے وہ صبر واستقلال۔ ضبط وسکون اور تحمل علی الشدائد پیدا کرنا مقصود تھا جو ہر اولوالعزم اور باوقار جماعت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ سال میں مہینہ بھر طلوعِ آفتاب سے غروب تک بھوکا پیاسا رہنے کو اس لئے فرض کر دیا گیا کہ اللہ کا نام بلند کرنے والی جماعت میں اپنی جانوں پر کھیل کر کامیاب ہونے کی تڑپ زندہ اور پائندہ رہے اور لذاتِ نفس۔ عیش پسندی اور لہو ولعب کا وہ مرض پیدا ہی نہ ہو جو ہر مرنے والی اُمت کا پیش خیمہ ہوتا ہے (مثلاً) فرانس جیسی عظیم الشان۔ جابر وقاہر اور عالمگیر سلطنت کو جو شئے ایک ہفتے کے اندر تہس نہس کر گئی وہ یہی آرام طلبی۔ ناؤ نوش۔ شیطانی رقص وسرود اور اجتماعی اخلاقی موت تھی۔ لیکن آہ جب سے مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہوا ہے وہ رفتہ رفتہ اس عظیم الشان سبق کو بھولتا گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ یہ مجاہدانہ عمل بھی ثواب لوٹنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا! آج مسلمان آمدِ رمضان سے گھبرانے لگا ہے۔ اور صحت کو گرنے سے بچانے کے لئے یا تو روزہ رکھتا ہی نہیں یا دو دو مہینہ پیشتر ہی پر تکلف اکل وشرب اور بہترین عیش وعشرت کے سامان جمع کر کے قلعہ بندی شروع کر دیتا ہے۔

کو بھوک اور کمزوری کے حملہ سے محفوظ رہ سکے ۔

مُسلم ہندی شکم را بندہ

خود فروشے دل ز دیں برکندہ

حج ـــ اجتماعیتِ اسلام کا سب سے بڑا مظاہرہ ۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی کانفرنس اور حقیقتاً سب سے بڑی نماز حج ہے ۔ روئے زمین کے مومنوں کی جو چھوٹی چھوٹی جماعتیں روزانہ ، ہفتہ وار اور سالانہ محلّوں ، شہروں اور عیدگاہوں میں جمع ہوتی ہیں ۔ اُن کو سمیٹ کر عمر بھر میں کم از کم ایکبار ایک ہی مرکز پر صف آرا کرنے کی سبیل ہے ۔ یہ اللہ کے سپاہیوں کی سالانہ (Rally) ہے جو کفن بردوش اور سر برہنہ ایک ہی یونیفارم میں اپنے خدا سے دیوانہ وار عشق کا مظاہرہ کرنے جمع ہوتے ہیں ۔ میدانِ عرفات کا یکرنگ اجتماع اس امر کا اعلان ہے کہ خدا صرف ایک ہی ہے ۔ محمد ہی خاتم النّبیین ہیں ۔ سب انسان برابر ہیں ۔ کوئی اونچ نیچ نہیں ۔ اس سب کچھ سے بڑھ کر حج کا مقصودِ حقیقی یہ ہے کہ مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ایک مرکز سے بندھے رہیں ۔ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے دُکھ درد ۔ غم اور خوشی میں شریک ہوسکیں ۔ اُن کا باہم ائتلاف اور اتحاد اس درجہ گہرا اور قوی ہو کہ اُن کی قوت کو کوئی حیلہ ۔ کوئی طاقت پارہ پارہ نہ کرسکے ۔ ہر سال اجتماع کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس اُمت کے فرزند دنیا کو سر کرنے کے لئے نئے ولولے ۔ تازہ حوصلے ۔ مضبوط ارادے بے تاب آرزوئیں اور جوان اُمنگیں لے کر جایا کریں ۔

پھر یہ حج استطاعت والوں کے لئے فرض قرار دیا گیا ۔ تاکہ یہ لوگ اپنی پوری استطاعت کو نذرِ دین و ملت کرنے کا سبق سیکھیں ۔ مگر یہاں معاملہ ہی اُلٹا ہے ۔ بجائے اس کے کہ مالدار اور پڑھا لکھا طبقہ اس سب سے بڑے قومی اجتماع میں شرکت کر کے خود زندہ ہوتا اور ملت کو زندہ کرنے کی سعی کرتا دیگر شعائرِ اسلام کی طرح **حج** بھی بیچارے اُن غریبوں کے لئے رہ گیا ، جو اپنے شوقِ فراواں سے مجبور گھروں سے نکل پڑتے ہیں ۔ اور خیراتی ٹکٹ کی امید میں برسوں کراچی اور بمبئی کے حاجی کیمپوں اور گلیوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں ۔ ہمارے امیر ، وزیر خان بہادر اور خان صاحب حضرات اگر حج کا قصد فرماتے بھی ہیں ، تو اس وقت جب وہ ہر طرف سے فارغ ہو جاتے ہیں ۔ جب منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہیں رہتی ۔ ہاتھ پیر شل ہو چکتے ہیں ۔ دل و دماغ پر پیری کا زنگ

چڑھ چکتا ہے۔ غرضیکہ جب کسی کام کے نہیں رہتے۔ تو "حاجی صاحب" بننے کی سوجھتی ہے۔ اِن اللہ کے بندوں کو کون سمجھائے کہ حج کی روح یہ نہیں ہے! صحت و جوانی کے عالم میں عیش و عشرت کی مستی اور دولت کے خمار میں یہ بزرگ قصد فرماتے ہیں تو لندن کا۔ اور وہ خدا کا وہ سب سے پہلا گھر جس کو برکت اور ہدایت سے موسوم کیا گیا ہے ایک طرف رہ جاتا ہے۔ شاید اُن کا یہی خیال ہوتا ہے کہ ؎

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھینگے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھینگے!

حریفوں کو اگر کوئی چیز ناگوار ہے تو وہ مسلمانوں کی قوتوں کا سمٹنا اور اُن کو سمیٹنے کا سامان کرنا ہے۔ فرداً فرداً غلام مسلمان کو شریعت۔ طریقت۔ ولایت اور نبوت تک (!) کی اجازت دی جاسکتی ہے مگر جو چیز زہر قہر اور غضب ہے وہ مسلمان کی مرکزیت ہے لَا اِلٰہ کہنے والوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے دیا جائے تو قیامت سے پہلے قیامت نہ آجائے؟

یوں تو "ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ــــ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی" مگر مسلمانوں کی رہی سہی اجتماعی خو بو کو مٹانے کی جو بے پناہ سعی گذشتہ دو صدیوں اور خصوصًا پچھلے پندرہ بیس برس میں کی گئی ہے وہ خون کے آنسو رلانے والی ہے۔ ۱۹۰۳ء میں تقریبًا ایک لاکھ حاجی صرف ہندوستان سے گئے ہندوستانی حاجیوں کی یہ تعداد گھٹتے گھٹتے ۱۹۲۶ء میں صرف ۳۰ ہزار رہ گئی۔ چھ سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں ۳۰ ہزار سے دو تہائیاں گھٹ کر ۱۳ ہزار۔ ۱۹۳۳ء میں دس ہزار اور ۱۹۳۴ء میں ۹ کروڑ ہندی مسلمانوں میں سے صرف ۹ ہزار کو "حالات" نے حج کی اجازت دی! ۱۹۳۴ء میں تمام زائرینِ حرم کی تعداد صرف چھبیس ہزار تھی۔ گویا جتنے حاجی ۱۹۲۶ء میں صرف ہندوستان سے گئے تھے اس سے بھی دس ہزار کم! یعنی اوّل تو حج رہ ہی ایک رسم گیا تھا اور پھر وہ رسمِ کہن بھی گھٹتے گھٹتے یہاں تک آپہنچی ہے!

زکوٰۃ ــــ سب سے آخری اور بے حد اہم رکنِ دین زکوٰۃ ہے! زکوٰۃ کا مقصود یہ تھا کہ جو روحانی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور اجتماعی نظام کلمہ شہادت۔ نماز۔ روزہ اور حج سے پیدا ہو اُس کو اقتصادی طور پر ناقابلِ شکست و ریخت بنا دیا جائے۔ علاوہ ازیں دولت کی تقسیم اس طرز پر ہو کہ کوئی امیر نہ رہے۔ کوئی غریب نہ رہے۔ مگر آہ!

تخت و تاج کے ساتھ زکوٰۃ کا نظام بھی گیا۔ اور عملاً وہی کچھ ہو کر رہا جس کو مٹانے اور روکنے کے لئے امیر المومنین صدیقِ اعظمؓ نے مسیلمہ **کذاب** کی نبوّت کا تار و پود بکھیرا تھا!

یہاں ارکانِ اسلام کے تذکرہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام کا مقصودِ اصلی انسانوں کی ایسی اجتماعیت کا قیام تھا جس میں شرفِ انسانی کے سارے کمالات پوری شان سے جلوہ گر ہوں۔ جو تمام گذشتہ اُمتوں کی خوبیوں کا خلاصہ اور اُن کی کمزوریوں سے بلند و بالا ہو۔ جس کا دین سارے انسانوں پر غالب آنے والا اور جس کا ضابطہ سارے ضابطوں اور خود ساختہ آئینوں پر چھا جانے والا ہو۔ نبوّتِ محمدی کا یہی امتیازِ خصوصی ہے انہی معنوں میں آپ خاتم المرسلین ہیں اور اسی جہت سے اُمتِ محمدی، خیر الامم اور خاتم الاقوام ہے

(۹) ایک سوال کا جواب

یہ سوال حکمائے سیاست کو اکثر پریشان کرتا رہا ہے کہ تمام انسانوں کی ایک ہی جماعت یا ایک ہی سلطنت ممکن ہے بھی یا نہیں؟ اس کا جواب مختلف طریق سے دیا گیا ہے۔ بعض اوقات اس کو واہمۂ خلاق کی نادرہ کاری (Utopia) سے تعبیر کیا گیا۔ اور اگر اس امکان کو تسلیم کیا گیا تو اس کی بنیاد کو مُلوکی اور مادی اُصول پر سوچا سمجھا گیا۔ اسی لئے اس سمت میں کوئی سعی مشکور نہ ہو سکی۔ مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ عالم آرا سلطنتیں۔ جہاں گیر سطوتیں اس لئے نسیًا منسیا ہو گئیں کہ بنیادیں ہی غلط تھیں۔ اسلام اُممِ سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہے۔ وہ اس قسم کی سلطنت کی تعمیر تو نہیں چاہتا۔ اسی لئے کہ ؎

مُلوکیت بدینِ ما حرام است

مگر وہ ایک جہانگیر برادری ضرور تیار کرنا چاہتا ہے۔ جس کی تاسیس و تعمیر کے اصول عالمگیر۔ اٹل اور فطری ہوں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جبتک نسلی۔ لسانی۔ ملکی زنجیروں کو توڑ کر کوئی جماعت نہ اٹھائی جائے گی تمام انسانوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ اسلام جس جماعت کی تخلیق و تربیت کے لئے آیا ہے اس کا نام الہامِ خداوندی میں حزب اللہ قرار دیا ہے۔ اس کی رکنیت کا معیار مال و دولت ہے نہ جاہ و حشمت۔ نسل و رنگ ہے نہ ملک و قوم۔ بلکہ فقط **اعمالِ صالحہ** اور **ایمان باللہ** ہے۔ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم جب انسان اس معیار پر پورا اُترتا ہے تو اس مقامِ رفیع پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بن جاتا ہے

یہی معیار ہے جو ہر کامیابی۔ ہر بلندی اور ہر راحت و سرور کا اصلی مخزن ہے۔ اس جماعت میں ان اصولوں کے باوجود کیا سارے انسان شامل ہو جائیں گے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ کائنات ایک روحانی اور اخلاقی نظام کے ماتحت چلائی جا رہی ہے۔ (It is a moral and spiritual order) رزمِ خیر و شر، جوہرِ انسانی کو آشکارا کرنے کے لیے۔ زندگی کو ترقی و ترفع کے مدارج طے کرانے کے لیے ہے بالآخر شر پہ خیر غالب ہو کر رہیگا۔ حق سرفراز اور باطل سرنگوں ہو کر رہیگا۔ مزاجِ انسانی کی بے اعتدالیاں اعتدال پہ آکر رہینگی۔ نسلِ انسان از خود طوعاً و کرہاً اس ضابطہ کی پابند ہوتی جا رہی ہے اور ہو کر رہیگی۔

(۱۰) معیار اور اصل

اخلاق ہمیشہ ایک معیار یا بالفاظ دیگر ایک (right) پیش کرتا ہے۔ حکمائے مغرب نے معیار کی تعریف یہ کی ہے کہ اس تک کوئی نہ پہنچ سکے لیکن اس تک رسائی کے لیے کوشش جاری رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (Ideal) اور (Real) کا فرق ہی ہے جو ہر سعی و جہد میں جان ڈال کر معجزاتِ زندگی رونما کرتا ہے۔ مگر اسلام کا آئیڈیل تو ایسا ہے کہ اس پہ دنیا کا کامل ترین انسان پہنچ چکا ہے اور اس کے سچے نام لیوا اس پر ٹھیک اتر چکے ہیں۔

اس معیار کے قابل سارے انسان اپنے آپ کو بنا سکیں یا نہ بنا سکیں، اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ان اصولوں کی تطہیر و تنقیص ہے جن پر اخوتِ انسانی صحیح معنوں میں تعمیر ہوتی ہے۔ جماعت کی ترتیب یا ساخت کے لئے سب سے پہلی چیز افراد کی سیرت اور اس کے بعد اجتماعی کردار ہے۔ اسلام نے انفرادی اور سوشل اخلاق کو جو بلند قدر (Higher Value) اور نفیس معیار (Refined standard) دیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ابھی ابھی عرض کیا گیا تھا کہ اسلام سے پیشتر مذاہب کا خطاب قومی، وطنی اور نسلی تھا۔ ان کی تعلیمات میں وہ اجزا ضرور موجود تھے جو نتیجۃً وحدتِ انسانی کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے مگر کچھ تو ذہنِ انسانی کے پست ارتقائی مدارج کی وجہ سے اور کچھ ان پیغاموں کی جزوی اور نوعی حیثیت سے وہ عالم آرا اور قلوب گیر انقلاب نہ پیدا ہو سکا جو اسلام کی الہامی تعلیم نے پیدا کر دیا۔ اور اس کارنامہ و بنیاد اصل توحید ہے جس پر نظامِ اسلام تعمیر ہے۔ ساڑھے تیرہ سو سال میں اس کا جو اثر ہوا ہے وہ ظاہر و باہر ہے آج ہر طرف یہی پکار ہے کہ دنیا کے تفرقے مٹنے چاہئیں۔ یہاں تک کہ جنگیں بھی امن۔ وحدتِ آدم۔ حقوقِ انسانی۔

آزادیِ فکر و خیال وغیرہ وغیرہ کے نام پہ لڑی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نیکی کے نام پہ شرارت۔ جبر آئیلت کے نام پہ ابلیسیت دورِ حاضر کی مردود سیاست کی پیداوار ہے۔ مگر بہر حال ان تمام دعاوی کی تہ میں ایک عالمگیر ضمیر ہے جو بول رہا ہے۔ اِسی ضمیر کو اسلام اُبھارنا اور زندہ کرنا چاہتا ہے۔ آج تہذیب یافتہ اقوام کے لئے بعض دیدہ و دانستہ دھوکے ہلاکت انگیز ثابت ہو رہے ہیں مگر آخر ایک دن یہ کالعدم ہو کر رہینگے ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

نئی تہذیب کے فرزند قولاً تسلیم کریں یا نہ کریں عملاً وہ اسلامی تعلیمات کی طرف جانے پر مجبور ہیں۔ یہ صرف ایک دعوٰی ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے لئے کوئی اور چارہ ہی نہیں۔

(باقی باقی)

نقد و نظر

تفہیمات

یعنی مجموعۂ مضامین جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ مدیر "ترجمان القرآن"

قارئینِ طلوعِ اسلام کے لئے نہ تو جناب سید صاحب کسی تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ان کے مضامین۔ سید صاحب کے مضامین کا ایک مجموعہ اس سے پیشتر تنقیحات کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان اہم مضامین کا ایک حصہ آگیا ہے۔ جو ترجمان القرآن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور اسلامی تعلیم کے مہمات مسائل پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر مضمون سے پورا پورا اتفاق کریں۔ لیکن یہ ایک سنجیدگی کے ساتھ سوچنے والے اہلِ علم کے افکار کا مجموعہ ہے۔ اور اس لئے قابلِ قدر ترجمان القرآن کے سائز کے قریب ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے کتابت و طباعت اور کاغذ بھی ترجمان القرآن کے انداز کا ہے اور قیمت مجلد دو روپیہ بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن مبارک پاک بونچھ واڑ لاہور سے طلب فرمایئے

ندیم (گیا) کا بہار نمبر

طلوعِ اسلام میں ادبی رسائل پر کبھی تبصرہ نہیں کیا گیا اس لئے کہ ہمارے نزدیک یہ ذہنی تعیش اس زمانہ کی یادگار ہے جب قوم فارغ البال اور مرفہ الحال تھی۔ آج جبکہ ملتِ اسلامیہ موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسے اس قسم کے طاؤس و رباب کی خواب آور سحر آفرینیوں میں الجھائے رکھنا۔ اس کی خودکشی میں معاونت کرنا ہے۔ آج وہ وقت ہے کہ شاعر اپنے شعر سے۔ نثر نگار اپنے مضامین سے۔ مفکر اپنے افکار و آراء سے۔ مدبر اپنی تدابیر و تجاویز سے۔ امیر اپنی دولت و ثروت سے۔ مزدور اپنے پھاوڑے اور کدال سے۔ ملت کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے۔ اسے تشتت و افتراق کی لعنت سے بچا کر اس میں پھر سے وحدتِ افکار و کردار پیدا کر دے۔ اس کی لامرکزیت کو مٹا کر اسے پھر سے ایک جیتے جاگتے مرکز سے وابستہ کر دے۔ آج بھی اسلام کی خدمت

اور یہی مسلمانوں کی دوست داری ہے۔ ہم زلف و کمر کے پیچیدہ مسائل اور ہجر و صال کے لاینحل دقائق پر بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ اب حالات کا یہی تقاضہ ہے کہ ان بوسیدہ لاشوں کو جتنا جلد ممکن ہو دفن کر دیا جائے اور اس کے بعد اپنی قوتوں کو کسی کام میں صرف کیا جائے۔ آج قوموں کی یہ حالت ہے کہ زمانہ صبح و شام ان کی تقدیریں بدل رہا ہے۔ اور پیشوایانِ اقوام عالم یعنی مسلمانوں کی یہ حالت کہ ان کی جماعت کا نوجوان اور صالح عنصر ہنوز اس گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ کہ

نزاکت کی حد ہے کہ ہر ہر قدم پر وہ چلنے سے پہلے کمر دیکھتے ہیں (ندیم صہ ۲۵۴)

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ ہم نے ادبی رسائل پر اس لئے کبھی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن ندیم کا یہ ساڑھے چار سو صفحہ کا پرچہ جو سامنے آیا تو دل کے زخموں نے ان الفاظ کی شکل اختیار کر لی۔ خصوصاً اس لئے کہ اس پرچہ کے ایڈیٹر قوم کے ہونہار نوجوان سید ریاست علی صاحب ندوی ہیں۔ جن سے قوم کو بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس تلخ نوائی سے مقصود ان کے کان تک یہ شکایت رنگیں پہنچانا ہے۔ کہ وہ حقائق کی دنیا کو چھوڑ کر کسی طلسمی وادی میں جا نکلے؟

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے ناداں نہ جل ترنگ

معیار السنۃ لختم النبوۃ

جناب محمود حسن خاں صاحب ٹونکی نے ختم نبوت پر ایک ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے جس کے ایک باب کی تلخیص جناب عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے زیر نظر رسالہ کی صورت میں شائع کی ہے۔ اس میں قدیم رنگ میں مسئلہ ختم نبوت پر عالمانہ بحث کی گئی ہے اور ختم نبوت کے اثبات میں قرآن و حدیث و آثار سے مفید دلائل جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن انداز بیان ایسا پریشان اور نامانوس ہے جس سے عوام کے لئے کتاب کی افادی حیثیت بہت کم ہو گئی ہے۔ ۸ ر میں کتاب خانہ عابد شاپ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے ضخامت ۵۵ صفحات۔ طباعت و کتابت معمولی

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے بسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات واخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدّن ومعاشرت کے خط وخال۔ اس تعلیم وتہذیب۔ اس کے دنیائی معاملات۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلّقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز واسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لیے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کرلیا جائے تو طلبا کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر۔ محصول ا ر +

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی